ہراتوار کو روزنامہ اسلام کے ساتھ شائع ہوتا ہے

بچوں کا اسلام

اتوار 29 ذیقعدہ 1434ھ مطابق 6 اکتوبر 2013ء

کون بنے گا کروڑپتی

رہائی

لینڈ کروزر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس سے بہتر

''اور اس سے بہتر کس کا دن ہوگا جس نے اپنے چہرے کو (سارے وجود سمیت) اللہ کے آگے جھکا دیا ہو جب کہ وہ نیکی کا خوگر بھی ہو اور جس نے سیدھے سچے ابراہیم کے دین کی پیروی کی ہو اور (یہ معلوم ہی ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو اپنا خاص دوست بنا لیا تھا۔'' (سورہ نسا:125)

شہید

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
''شہید قتل ہونے کی تکلیف نہیں پاتا مگر جس طرح تم میں سے کسی کو چیونٹی کے کاٹنے کی تکلیف ہوتی ہے، بس اتنی تکلیف محسوس کرتا ہے۔''
(ترمذی)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ: ان دو باتیں کا نام اگر دو مظلوم رکھ دوں تو بالکل بے جا نہیں ہوگا... کیوں کہ ان دو باتیں میں شروع سے آخر تک ان دو مظلوم ترین انسانوں ہی کا ذکر ہوگا... اب یہ اور بات ہے کہ آپ ان پر مسکرانا شروع کر دیں... ان پر ترس کھانے کی بہرحال دور دور تک کوئی گنجائش نہیں...

ہوا کچھ یوں کہ بچوں کا اسلام کی پرنٹنگ کے سلسلے میں فون کرنے کی ضرورت پیش آ گئی... اس قسم کے تمام کاموں میں مجھے مولانا محمد افضل صاحب کو فون کرنا ہوتا ہے... مولانا محمد افضل صاحب ہمارے روزنامہ اسلام کے ایڈیٹر ہیں آخر... اور اتفاق سے ہیں بھی انجینئر... روزنامہ اسلام ماشاء اللہ صرف کراچی اور لاہور سے ہی نہیں، اسلام آباد، ملتان، مظفر آباد اور پشاور سے بھی شائع ہوتا ہے... گویا پورے پاکستان میں چھ مقامات سے شائع ہوتا ہے... ان تمام کے معاملات انھی کے ذمے ہیں... خود ان کا قیام ملتان میں ہے... لیکن سبھی شہروں کے دورے کرنے پڑتے ہیں... کبھی کراچی میں پائے جاتے ہیں تو کبھی ملتان میں... اور کبھی باقی شہروں میں سے کسی شہر میں...

ضرورت محسوس ہونے پر میں نے انھیں فون کیا... اور چھوٹتے ہی بول اٹھا:

''آپ نے آج کا بچوں کا اسلام دیکھا۔''

میرا جملہ سن کر انھوں نے کچھ ایسی سرد آہ بھری کہ شدید موسم گرما ہوتے ہوئے بھی مجھے ایک پرلطف ٹھنڈ کا احساس ہوا... یوں لگا جیسے سرد ہوا کا کوئی جھونکا جسم سے ٹکرایا ہو... پھر کہنے لگے:

''ہاکر کل بھی اخبار ڈال کر نہیں گیا اور پرسوں بھی... خیال ہے، آج بھی نہیں آئے گا۔''

یہ بات سن کر مارے حیرت کے میری سٹی گم ہو گئی... کیونکہ عام لوگ تو اکثر ہاکروں کی شکایتیں کرتے نظر آتے ہیں... لیکن مولانا محمد افضل صاحب تو روزنامہ اسلام کے ایڈیٹر ہیں... ان کے گھر اخبار کا نہ آنا حد درجے اچنبھے کی بات تھی...

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں... میرا مطلب ہے... بھلا یہ کیسے ممکن ہے... کہ ہاکر ادھر اُدھر لوگوں کو تو اخبار دے جائے اور آپ کے ہاں نہ دے کر جائے۔''

اب انھوں نے جو کہا، وہ پہلے سے بھی زیادہ حیرت کی بات تھی... کہنے لگے:

''ایسا تو اکثر ہوتا ہے... وہ اکثر اخبار ڈال کر نہیں جاتا... دراصل وہ سوچتا ہے... پتا نہیں کون مولوی صاحب ہیں... جن کے لیے اعزازی اخبار جاری کیا گیا ہے... اس لیے کبھی ڈال جاتا ہے... کبھی نہیں۔'' بچوں کا اسلام دفتر جا کر ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔

اب میری حیرت کا کیا پوچھنا... میں نے ان سے پوچھا:

''کیا اسے بتایا نہیں گیا... آپ کون ہیں؟''

ان کی طرف سے جواب آیا:

''نہیں... نہ میں نے کبھی اسے بتایا... نہ ملتان کے دفتر والوں نے۔''

''حد ہو گئی... آپ بھی عجیب ہیں اور ملتان کے دفتر والے بھی غریب ہیں... یعنی ملا جلا کر عجیب و غریب ہیں۔''

اس پر افضل صاحب ہنس دیے، پھر چونک کر پوچھ بیٹھے:

''آپ کا ہاکر تو آپ کو باقاعدہ اخبار دے کر جاتا ہے نا۔''

میں نے فوراً کہا:

''بھلا وہ مجھے باقاعدہ کیوں نہ دے کر جائے گا... ہر ماہ کی آخری تاریخ کو اخبار کا بل جو وصول کرنا ہوتا ہے۔''

اب حیران ہونے کی باری ان کی تھی... چلا کر کہنے لگے:

''کیا کہا... آپ اخبار کا بل دیتے ہیں... لیکن آپ کا تو اعزازی اخبار لگا ہوا ہے شروع سے... یعنی جب سے بچوں کا اسلام شروع ہوا ہے۔''

''ارے باپ رے۔'' میں دھک سے رہ گیا، پھر میں نے کہا:

''لیکن میں تو گیارہ سال سے پورا بل دیتا ہوں۔''

اب ان کی حیرت بے چاری بے ٹھکانہ ہو گئی... میرا مطلب ہے، ان کی حیرت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا... کہنے لگے، میں ابھی ان کی خبر لیتا ہوں...

ان کے خبر لینے کا نتیجہ فوراً ہی برآمد ہو گیا... پہلے لاہور دفتر کا فون ملا، پھر جنگ کے ایجنسی ہولڈر کا... پھر ہاکر صاحب بھی تشریف لائے... لیکن میں نے انھیں ایک لفظ بھی نہیں کہا...

مجھے تو بہرحال اعزازی اخبار ملنے لگ گیا ہے... لیکن لگتا ہے... مولانا افضل صاحب کو اب بھی ہاکر کبھی اخبار دے جاتا ہے... کبھی نہیں... میری دعا ہے... وہ ہاکر صاحب... یہ دو باتیں پڑھ لیں... آمین!

والسلام

[signature]

سالانہ زرِ تعاون اندرونِ ملک: 600 روپے، بیرونِ ملک: 3700 روپے

خط کتابت کا پتہ

''بچوں کا اسلام'' دفتر روزنامہ اسلام ناظم آباد 4 کراچی فون: 021 36609983

بچوں کا اسلام انٹرنیٹ پر بھی: www.dailyislam.pk ای میل: bkislam4u@gmail.com

خانہ بدلنے کی ضرورت

"سنیے! میں خودکشی کرنا چاہتا ہوں۔"

مولانا صاحب چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ پچاس پچپن سال کی عمر کا پختہ عمر آدمی تھا۔ لباس اور تراش خراش سے مال دار آدمی دکھائی دیتا تھا۔ چہرے سے بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔ مولانا صاحب فجر کی نماز پڑھ کر مسجد کے صحن میں ابھی مصلےٰ پر ہی بیٹھے تھے کہ یہ شخص اُن کے قریب آ کر بیٹھ گیا تھا۔

"کیا فرمایا آپ نے؟" مولانا صاحب نے پلکیں جھپکاتے ہوئے پوچھا۔

"میں خودکشی کرنا چاہتا ہوں۔"

"خودکشی تو ہمارے مذہب میں حرام ہے۔"

"لیکن کیوں؟"

"اس لیے کہ آپ جس مسئلے کی وجہ سے پریشان ہو کر خودکشی کرنا چاہتے ہیں، اللہ پاک اس مسئلے کو اپنی قدرت سے حل کرنے پر قادر ہیں۔ جب ایک پریشانی سے نجات کا راستہ موجود ہے تو پھر اس کی وجہ سے اپنی قیمتی زندگی کو کیوں ختم کیا جائے۔"

"لیکن میں تو ساری زندگی بھاگ بھاگ کر تھک گیا ہوں، مجھے چین و سکون میسر نہیں آ سکا۔ طالب علمی کے زمانے میں جب سکول میں پڑھتا تھا تو یہ سوچا کرتا تھا کہ یہ چند سال ہیں محنت و مشقت کے۔ جب پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بن جاؤں گا تو سکون سے زندگی گزرے گی۔ پھر میں پڑھ لکھ کر انجینئر بن گیا تو اس فکر میں لگ گیا کہ اچھی سی نوکری مل جائے اور شادی ہو جائے گی تو باقی زندگی مزے سے گزرے گی۔ پھر اچھی ملازمت بھی مل گئی اور شادی بھی ہو گئی، لیکن دل کو سکون پھر میسر نہ ہو سکا۔ بیوی نے مشورہ دیا کہ اچھا سا گھر بنا لو، تا کہ ہم اور ہمارے بچے سکون سے اس میں رہ سکیں۔ شان دار بنگلہ بنانے کے باوجود بھی نرم نرم بستر پر میں پرسکون نیند کو ترستا رہا۔ یہاں تک کہ میرے چار بچے بھی پیدا ہو گئے۔ دل میں یہی خیال تھا کہ چلو جب یہ بچے بڑے ہوں گے اور ساری ذمہ داریاں سنبھال لیں گے تو میں فارغ ہو جاؤں گا اور پھر سکون کی زندگی گزاروں گا۔ لل! لیکن۔" وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔

"لیکن کیا؟" مولانا نے استفسار کیا۔

"بچے بڑے ہو گئے اور سب کو پڑھا لکھا کر اچھے عہدوں پر لگوا دیا ہے اور دو لڑکوں کی شادیاں بھی کر دی ہیں اور ایک بچی اور بچہ ابھی باقی ہیں۔ اب پریشان کن بات یہ ہے کہ میری اولاد کو مجھ سے وہ محبت نہیں ہے جو اولاد کو اپنے باپ سے ہوتی ہے اور ان کے پاس مجھے دینے کے لیے وقت ہی نہیں ہے۔ گھر میں آ کر تنہا اپنے کمرے میں پڑا رہتا ہوں۔ بیوی کی طبیعت میں بھی اب چڑچڑا پن آ گیا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر لڑ پڑتی ہے اور گھنٹوں ٹی وی اور انٹرنیٹ میں مصروف رہتی ہے۔ اب تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مر کر ہی سکون ملے تو ملے۔ اس دنیا میں تو بظاہر سکون و اطمینان ملنا ممکن نظر نہیں آ رہا۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔

محمد نصیر ہزاروی۔ کراچی

"بھائی صاحب! مرنے کے بعد بھی سکون و اطمینان اسے نصیب ہوگا جو اللہ پاک کی ذات کو راضی کر کے جائے گا۔ آپ سے دراصل ایک بنیادی غلطی ہو گئی۔" مولانا نے کہنا شروع کیا۔

"بنیادی غلطی؟ کیا مطلب؟" وہ حیرت سے بولا۔

"جی ہاں! آپ سے یہ بنیادی غلطی ہو گئی کہ آپ سکون اور چین وہاں تلاش کرتے رہے جہاں اللہ پاک کی ذات نے رکھا ہی نہیں۔ دنیا اور اس کے سارے اسباب کو اللہ پاک نے ہمارے سکون و اطمینان کے لیے نہیں بنایا، بلکہ ہمارے امتحان کے لیے بنایا ہے کہ ان اسباب میں لگ کر کون انھی کا ہو جاتا ہے اور کون اپنے رب کو راضی کرتا ہے۔ جب اللہ پاک کی ذات نے دنیا کے اسباب میں چین و سکون کو رکھا ہی نہیں تو پھر چاہے کسی کے پاس دنیا کے کتنے ہی اسباب جمع ہو جائیں، سکون اور چین نہیں ملے گا، کیوں کہ دلوں کا سکون اور اطمینان تو اللہ پاک نے اپنے پورے دین پر چلنے میں رکھا ہے۔"

"اچھا!" مارے حیرت کے اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ عین اسی وقت مسجد کی دیوار پر بیٹھے کبوتروں میں سے ایک کبوتر اُڑ کر ان کے قریب صحن میں آ بیٹھا۔ کبوتر کو دیکھتے ہی ایک مثال مولانا صاحب کے ذہن میں آ گئی اور وہ دوبارہ فرمانے لگے۔ "آپ نے شاید دیکھا ہو کہ دیہاتوں میں ان کبوتروں کو رکھنے کے لیے ایک کنواں کھود کر اس میں چاروں طرف خانے بنا کر اس میں ان کو رکھا جاتا ہے۔"

"جج! جی! ہاں!"

"اس کنویں میں کچھ نیچے کے خانوں میں ہوتے ہیں اور کچھ اُوپر کے خانوں میں۔ اب اگر یہ کبوتر اس محنت میں لگ جائیں کہ نیچے کے خانے سے اوپر کے خانے میں آ جائیں، تا کہ دانہ دنکا کا مسئلہ حل ہو جائے تو کیا نیچے کے خانے سے اوپر کے خانے میں آنے سے ان کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

"جی نہیں!"

"بالکل ٹھیک! ان کا مسئلہ حل نہیں ہوگا، بلکہ آپس میں بھی جھگڑا فساد ہوگا، لیکن اگر یہ کبوتر اپنے مالک کو راضی کرنے میں لگ جائیں تو پھر چاہے یہ نیچے کے خانہ میں ہوں یا اوپر کے، ان کے دانے کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

"جی ہاں!"

"بس! یہی بات یاد رکھنے کی ہے۔ ایک ہے خانہ بدلنے کی محنت اور ایک ہے مالک کو راضی کرنے کی محنت، تو آپ ہی بتایئے مسئلہ کس محنت سے حل ہوگا؟"

"مالک کو راضی کرنے کی محنت سے۔"

"تو پھر جو پچھلی زندگی اللہ کو ناراض کر کے گزر گئی، اب اس پر توبہ استغفار ہو۔ اب تک آپ خانہ بدلنے کی محنت کرتے رہے، اس لیے مسئلہ اُلجھتا رہا اور آج سے نیت کریں کہ اپنے خالق و مالک کو راضی کرنے کی محنت کریں گے۔ ان شاء اللہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

"ان شاء اللہ!" اس کے منہ سے نکلا۔

میل کر دینا

نظم دو چار میل کر دینا
اپنے اشعار میل کر دینا

ہلکی پھلکی سی چٹپٹی نظمیں
کر کے تیار میل کر دینا

باسی اشعار کی نہیں حاجت
تازہ افکار میل کر دینا

گھر کا نیٹ ڈس کنکٹ ہو تو اثر
جا کے بازار میل کر دینا

ہو نہ بازار سے بھی گر ای میل
خط بصد پیار میل کر دینا

شوق سے اشتیاق احمد کو
اپنا ہتھیار میل کر دینا

اثر جونپوری

حضور نبی کریم ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنھم کے درمیان تشریف فرما تھے۔ ایسے میں ایک آدمی کے بارے میں کسی نے کہا:

''کوئی دوسرا اس کے کھانے کا بندوبست کر دے تو وہ کھالیتا ہے، کوئی دوسرا آدمی اس کی سواری پر کجاوہ کس دے تو وہ اس پر سوار ہو جاتا ہے۔'' (مطلب یہ تھا کہ وہ بہت سست ہے، اپنے کام خود نہیں کرتا)

حضور ﷺ نے یہ سن کر فرمایا:

''تم اس کی غیبت کر رہے ہو۔''

ان لوگوں نے کہا:

''اے اللہ کے رسول! ہم نے تو وہی بات کہی ہے، جو اس میں ہے۔''

آپ نے جواب میں فرمایا:

''غیبت ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ تم اپنے بھائی کا وہ عیب بیان کرو جو اس میں موجود ہے۔''

یعنی اسی کو تو غیبت کہتے ہیں، اگر وہ بات اس میں نہ ہو تو پھر تو یہ بہتان ہوگا۔

○

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ سفروں میں ایک صاحب رہا کرتے تھے۔ وہ آپ دونوں کی خدمت کرتے تھے۔ ایک دن ان کے ذمے کھانا پکانا تھا، لیکن وہ سوتے رہ گئے۔ اس طرح وقت پر کھانا نہ پک سکا۔ ان دونوں حضرات نے ان کے بارے میں یہ کہہ دیا: ''یہ تو سوؤ ہے۔''

پھر ان حضرات نے انھیں جگا دیا اور ان سے کہا:

''تم حضور ﷺ کی خدمت میں جاؤ اور آپ سے کہو کہ ہم نے سالن منگوایا ہے۔''

انھوں نے جا کر آپ ﷺ سے یہ عرض کر دیا۔ آپ نے سن کر فرمایا:

''وہ دونوں تو کھانا کھا چکے ہیں۔''

ان صاحب نے جا کر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو آپ کا جواب بتا دیا۔ اب یہ دونوں حضرات خود آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے عرض کیا:

قدم بہ قدم

''اے اللہ کے رسول! ہم نے کون سے سالن سے روٹی کھائی ہے؟''

آپ نے فرمایا: ''اپنے بھائی کے گوشت سے، اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ میں اس کا گوشت تم دونوں کے سامنے والے دانتوں میں دیکھ رہا ہوں۔''

ان دونوں حضرات نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! ہمارے لیے استغفار فرما دیجیے۔''

آپ نے فرمایا:

''اس سے کہو! وہ تمہارے لیے استغفار کرے۔'' (یعنی جس کی غیبت کی ہے، اس سے معافی مانگو)

○

ایک رات حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مدینہ منورہ کا پہرہ دیا۔ یہ حضرات چلے جا رہے تھے کہ ایک گھر میں چراغ کی روشنی نظر آئی۔ یہ حضرات اس گھر کی طرف چل پڑے۔ نزدیک پہنچے تو گھر کا دروازہ بند نظر آیا اور اندر کچھ لوگ زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا:

''کیا آپ جانتے ہیں، یہ گھر کس کا ہے۔''

انھوں نے کہا: ''جی نہیں! میں نہیں جانتا۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''یہ ربیعہ بن اُمیہ بن خلف رضی اللہ عنہ کا گھر ہے اور یہ سب اس وقت شراب پیے ہوئے ہیں (یعنی ان کے شور سے یہ بات ثابت ہے) آپ کا کیا خیال ہے (ہمیں کیا کرنا چاہیے)۔''

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا:

''میرا خیال ہے کہ ہم وہ کام کر بیٹھیں گے جس سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں روکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''اور سراغ مت لگاؤ اور ہم اس گھر کے افراد کا سراغ لگانے لگ گئے ہیں۔''

یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ آگے بڑھ گئے۔

ختمِ نبوت زندہ باد

دین محمد۔ بیکر

ایک دکان پر دو تین لڑکے بیٹھے تھے۔ ان کے قریب سے ایک قادیانی گزرا۔ انھوں نے اسے سنانے کے لیے مرزا کو دو تین گالیاں نکال دیں۔

یہ واقعہ ہے اوکاڑہ شہر کا اور پاکستان بننے سے پہلے کا۔ اس وقت انگریز حکومت قادیانیوں کا پورا پورا ساتھ دیتی تھی۔ اس قادیانی نے ان مسلمان لڑکوں کے خلاف عدالت میں ہتکِ عزت کا دعویٰ کر دیا۔ اس پر اوکاڑہ کے مسلمانوں نے مجلس احرار لاہور کے دفتر کو خط لکھ کر ساری صورتِ حال بتائی اور درخواست کی کہ ان کی مدد کے لیے دفتر سے کسی کو بھیجا جائے جو عدالتی کارروائی میں ہماری مدد کر سکے۔

حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ نے مولانا محمد حیات رحمہ اللہ کو حکم دیا:

''آپ اوکاڑہ چلے جائیں اور اس کیس کی پیروی کریں۔ مولانا حیات اوکاڑہ پہنچ گئے۔ دوستوں سے ملاقات کی، سارے کیس کا مطالعہ کیا، پھر ایک وکیل کی خدمات حاصل کیں۔ اسے کتابیں دکھائیں، حوالے دکھائے اور یہ بھی بتایا کہ مرزا نے مسلمانوں کو کیا کیا گالیاں دی ہیں۔

مقررہ تاریخ کو عدالت لوگوں سے کھچا کھچ بھر گئی۔ سب لوگ اس مقدمے کی کارروائی کو سننا چاہتے تھے۔ مولانا حیات صاحب نے وکیل کی جو تیاری کرائی تھی، وہ سب یونہی رہ گئی، وکیل اس طرف آیا ہی نہیں بلکہ اس نے عدالت میں اس قادیانی سے کہا:

''آپ بتائیں! ان لوگوں نے مرزا کو کون سی گالی دی ہے۔''

قادیانی کو یہ سن کر سکتہ ہو گیا کہ وکیل نے یہ کیا سوال کر دیا اور مجسٹریٹ منہ پر رومال رکھ کر مسکرانے لگا کہ وکیل نے کیا خوب سوال کیا ہے۔ آخر تنگ آ کر مرزائی نے کہا:

''مجھے یاد نہیں کہ کون سی گالی نکالی تھی۔''

اس پر وکیل نے کہا:

''کوئی بات نہیں، میں گالیاں نکالتا ہوں۔ آپ سنتے جائیں۔ جب وہ گالی آئے، مجھے بتا دیں۔''

وکیل نے ایک ہی سانس میں مرزائی کو کئی گالیاں نکال دیں، پھر اس نے قادیانی سے پوچھا:

''کیا ان گالیوں میں وہ گالی آئی ہے جو ان لڑکوں نے نکالی ہے۔''

قادیانی نے پھر کہا:

''مجھے یاد نہیں۔''

اس پر وکیل نے کہا:

''تو پھر اور گالیاں سنو۔''

اس مرتبہ وکیل نے پوری 51 گالیاں نکال دیں۔ مجسٹریٹ اور تمام حاضرین بری طرح ہنس رہے تھے۔ بس مرزائی ساکت کھڑا تھا۔ اس کا رنگ فق تھا۔ اب پھر وکیل نے کہا:

''ان میں سے کوئی گالی آئی ہے۔''

اس نے پھر کہا: ''مجھے یاد نہیں۔''

اب وکیل نے کہا: ''میں اور گالیاں یاد کر کے آؤں گا۔ آپ کل کی تاریخ دے دیں، اسے بھی شاید کل تک وہ گالی یاد آ جائے۔''

دوسرے دن جب وکیل اور مسلمان عدالت میں پہنچے تو قادیانی وہاں موجود نہیں تھا۔ مجسٹریٹ نے وکیل صاحب کو بتایا:

''وہ کل ہی درخواست دے گیا تھا کہ ہم اپنا کیس واپس لیتے ہیں۔''

اس طرح مسلمان وہ کیس جیت گئے۔

''اور سراغ مت لگاؤ اور ہم اس گھر کے افراد کا سراغ لگانے لگ گئے ہیں۔''

یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ آگے بڑھ گئے۔

○

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک صاحب کئی دن سے نظر نہیں آئے تھے، آپ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

''آئیں! فلاں کے گھر جا کر دیکھتے ہیں کہ وہ کس کام میں لگے ہوئے ہیں۔''

چنانچہ یہ حضرات ان کے گھر گئے۔ انھوں نے دیکھا، ان کے گھر کا دروازہ کھلا ہے اور وہ اپنے گھر میں بیٹھے ہیں اور ان کی بیوی پینے کی کوئی چیز برتن میں ڈال ڈال کر انھیں پلا رہی ہے۔ یہ دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

''اس کام میں لگ کر انھوں نے ہمارے پاس آنا چھوڑا ہوا ہے۔''

حضرت عبدالرحمٰن نے عرض کیا:

''آپ کو کیسے پتا چلا کہ اس برتن میں کیا ہے۔''

یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا:

''کیا آپ کو یہ ڈر ہے کہ ہم جاسوسی کر رہے ہیں جس سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے۔''

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے عرض کیا:

''اے امیر المومنین! بلاشبہ یہ جاسوسی ہے۔'' (جس سے اللہ نے روکا ہے)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا:

''اب اس گناہ سے توبہ کا کیا طریقہ ہے۔''

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے عرض کیا:

''آپ کو اس کی جو بات معلوم ہوئی ہے، وہ اسے نہ بتائیں اور آپ انھیں دل میں اچھا ہی خیال کریں۔''

یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہاں سے لوٹ آئے۔

○

کچھ مسافروں نے مدینہ منورہ کے ایک کونے میں آ کر پڑاؤ ڈالا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ایک رات ان کا پہرہ دینے کے لیے چلے گئے۔ جب رات کا کچھ حصہ گزر گیا تو آپ ایک گھر کے پاس سے گزرے۔ آپ نے دیکھا، اس گھر میں بیٹھے ہوئے کچھ لوگ کچھ پی رہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پکار کر کہا: ''کیا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو رہی ہے۔''

ان میں سے ایک نے کہا:

''جی ہاں! اللہ کی نافرمانی ہو رہی ہے۔ اللہ کی نافرمانی ہو رہی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسا کرنے سے روکا ہے۔'' (یعنی لوگوں کے گھروں کے اندرونی حالات معلوم کرنے سے منع فرمایا ہے)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سنا تو انھیں ان کے حال پر چھوڑ کر واپس آ گئے۔ (جاری ہے)

تصویر کی دھمکی (5)

اشتیاق احمد

ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے وہ ہوٹل کے پچھلے دروازے سے باہر نکلے... سردار ہارون کی کوٹھی کے بارے میں انھوں نے پہلے ہی شابو سے معلوم کرلیا تھا... اس نے سردار ہارون کا پتا انھیں تفصیل سے سمجھا دیا تھا اور پچھلے دروازے کے بارے میں بیرے نے بتایا تھا کہ ساری رات کھلا رہتا ہے اور ہوٹل میں ٹھہرنے والے کسی وقت بھی آجا سکتے ہیں...

دونوں پیدل ہی چل پڑے... کوئی رکشا لینا انھوں نے مناسب نہیں سمجھا تھا... کیونکہ بعد میں ڈرائیور پولیس کو ان کے حلیے بتا سکتا تھا... شابو نے انھیں بتایا کہ سردار ہارون کی کوٹھی ہوٹل گرین روز سے تین فرلانگ سے زیادہ دور نہیں ہے... یہ فاصلہ ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا...

''یار آصف، میرا دل دھڑک رہا ہے... میری ایک تجویز ہے، کم از کم ہم سردار ہارون اور اس کی بیگم کو کلوروفارم کے ذریعے بے ہوش نہیں کریں گے... کہیں کلوروفارم انھیں نقصان نہ پہنچا دے اور ہم مجرم نہ بن جائیں۔''

''مجرم تو ہم اس کی کوٹھی میں داخل ہوتے ہی بن جائیں گے... کیا یہ غیر قانونی اقدام نہیں ہوگا۔''

''بے شک ہوگا، لیکن یہ اتنا بڑا جرم نہیں ہوگا، جتنا کلوروفارم سے دو آدمیوں کو بے ہوش کرنا۔''

''خیر دیکھا جائے گا، اگر ہم نے ضرورت محسوس کی تو کلوروفارم استعمال نہیں کریں گے۔'' آصف نے اس کی بات مانتے ہوئے کہا۔

تقریباً آدھ گھنٹے بعد وہ سردار ہارون کی کوٹھی کے سامنے پہنچ گئے... نہ جانے کیوں ان کے دل دھک دھک کرنے لگے... اس قسم کے کاموں سے آئے دن انھیں واسطہ پڑتا رہتا تھا... لیکن دل اس انداز سے نہیں دھڑکے تھے...

''خدایا رحم، میرا دل مجھے خطرے کی گھنٹی سنا رہا ہے۔'' آفتاب نے گھبرا کر کہا۔

''اپنے دل کو سنبھال کر رکھو۔'' آصف نے منہ بنایا۔

کوٹھی کا پھاٹک بند تھا... آس پاس ہُو کا عالم تھا، دور دور کوئی نہیں تھا... البتہ کبھی کبھار دور کوئی کتا ضرور بھونکنے لگتا... انھوں نے کوٹھی کے گرد ایک چکر لگایا اور پھر شابو کے بیان کے مطابق انھیں وہ درخت نظر آگیا، جس کی ایک شاخ چار دیواری تک جا رہی تھی... اس درخت پر چڑھنے میں انھیں کوئی دقت نہیں ہوئی... تھوڑی دیر بعد وہ چار دیواری کے اندر کھڑے تھے... ابھی تک انھیں کسی خطرے کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا... اس کے باوجود دل اور بھی زور زور سے دھک دھک کرنے لگے تھے...

''یار آصف، یہ آج میرے دل کو کیا ہوگیا؟''

''تمہارے دل کو وہم ہوگیا ہے اور وہم کا علاج حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔'' آصف نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

دونوں روش تک پہنچ گئے... اور روش انھیں برآمدے تک لے آئی... زیرو کا بلب ہلکی سی روشنی پھیلا رہا تھا، ورنہ وہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہ جاتے... برآمدے کے دونوں طرف انھیں کمروں کے دروازے نظر آئے... دروازے بند تھے... برآمدے میں بھی زیرو کا بلب جل رہا تھا... برآمدے کے آخر میں انھیں سامنے ایک کمرے کا دروازہ نظر آیا، یہ دروازہ بھی بند تھا... وہ چکرا کر رہ گئے... شابو نے کہا تھا کہ دروازہ کھلا ہوگا... اب وہ کس طرح اندر داخل ہوں... دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر واپس مڑے... برآمدے سے نکل کر دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے آخری کمرے تک آئے... یہاں اس کمرے کی کھڑکی موجود تھی اور کھلی تھی... یہ اتنی اونچی بھی نہیں تھی کہ وہ اسے نہ پھلانگ سکتے... پہلے آفتاب نے دونوں ہاتھ کھڑکی پر رکھے اور اندر کود گیا... اس کے کودنے سے ہلکی سی دھمک پیدا ہوئی... آصف دم سادھے باہر کھڑا رہا، تاکہ اگر سردار ہارون یا اس کی بیگم کی آنکھ کھل جائے تو ان میں سے صرف ایک سردار ہارون کی نظروں میں آئے، لیکن جب کوئی آواز سنائی نہ دی تو اس نے بھی ہاتھ چوکھٹ پر رکھے اور اُچک کر اندر پہنچ گیا... اُس نے دیکھا، کمرے میں سبز رنگ کا زیرو کا بلب جل رہا تھا... آفتاب دیوار سے لگا کھڑا تھا... کمرے کے دائیں طرف دیوار کے ساتھ دو مسہریاں بچھی تھیں... ان پر ایک مرد اور ایک عورت پڑے سو رہے تھے... چھت والا پنکھا چل رہا تھا، مسہریوں کے سرہانے کی طرف ایک بڑی سی فولادی تجوری دیوار میں نصب تھی... آصف نے آفتاب کی طرف دیکھا، جیسے پوچھ رہا ہو، کلوروفارم استعمال کریں یا نہیں... آفتاب نے انکار میں سر ہلایا... اسی وقت سردار ہارون نے کروٹ لی اور ہاتھ پیر ہلانے لگا... یہ ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا... رنگ سیاہی مائل، چہرے پر چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی تھی، جسم سڈول تھا... عورت موٹے جسم کی تھی... سردار ہارون کے ہاتھ پیر ہلانے سے دونوں پریشان ہوگئے... آصف نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور کلوروفارم والی شیشی نکالی... اس نے آفتاب کی طرف اس طرح دیکھا، جیسے کہہ رہا ہو، بھئی اس کے بغیر کام نہیں چلے گا، اُس نے جیب سے اپنا رومال نکالا اور ہاتھوں کو ناک سے دور رکھتے ہوئے شیشی کا ڈھکنا اتارا... اس پر رومال رکھا اور شیشی کو الٹ دیا، پھر شیشی کو سیدھا

تتلی

تصورعباس سہو۔ کبیروالا

دوستو! تتلی ایک انتہائی خوب صورت کیڑا ہے۔ اس کا شمار حشرات میں ہوتا ہے۔ یہ مختلف رنگوں میں پائی جاتی ہے، لیکن اس کی کچھ اقسام ہیں۔ کچھ ایسی ہیں جو رنگ برنگی ہوتی ہیں اور بہت خوب صورت دکھائی دیتی ہیں۔ تتلی زیادہ تر باغوں اور پھلواریوں میں پھولوں پر بیٹھی یا اڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ دراصل اس کی اصل غذا پھولوں کا رس ہوتا ہے۔ تتلی کی پرواز بہت تیز ہوتی ہے۔ آپ کو یہ بتاتے چلیں کہ تتلی کی یہ پرواز سورج کی روشنی کے ساتھ ساتھ درجہ حرارت کی وجہ سے بھی ہوتی ہے۔ یہ بہت حیران کن پرواز ہے۔

تتلی کا جسمانی درجہ حرارت اگر 28 ڈگری سینٹی گریڈ ہو تو یہ پرواز نہیں کر سکتی۔ اس صورت میں تتلی اپنے دونوں بازوؤں یعنی پروں کو پھیلا دیتی ہے اور جسم کا بالائی حصہ سورج کی جانب کر دیتی ہے، تاکہ اس کا جسم مناسب درجہ حرارت جذب کر سکے۔ جب اس کے جسم کا درجہ حرارت 40 ڈگری سینٹی گریڈ تک پہنچ جاتا ہے تو تتلی 90 کے زاویے پر مڑ جاتی ہے اور اس طرح بھی یہ سورج کی شعاعیں جذب کر سکتی ہے۔ جب یہ مخصوص درجہ حرارت یعنی 53 ڈگری سینٹی گریڈ حاصل کر لیتی ہے تو پرواز کرنے لگتی ہے۔

یہ تو ہوگئی تتلی کی پرواز کی بات! اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تتلی کے جسم پر جو رنگ برنگے دھبے ہوتے ہیں وہ صرف اس کی خوب صورتی میں اضافہ کرتے ہیں یا ان کا کوئی اور بھی مقصد ہوتا ہے؟ تو دوستو! یہ دھبے تتلی کی خوب صورتی میں تو اضافہ کرتے ہی ہیں مگر ساتھ ساتھ اس کے جسم کا درجہ حرارت برقرار رکھنے میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ دھبے پروں پر مخصوص جگہوں پر ہوتے ہیں جنھیں زیادہ درجہ حرارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس مخصوص نقش و نگار کی بدولت تتلی کی جلد گرم رہتی ہے اور باقی جسم کی حرارتی ضروریات بھی اسی گرمی سے پوری ہو جاتی ہیں۔

مختلف قسم کی تتلیاں مختلف طریقوں سے اپنا مطلوبہ درجہ حرارت حاصل کرتی ہیں۔ بعض اقسام ایسی ہیں جن کے پروں پر دھبے نہیں ہوتے۔ تتلی کی ایک قسم پائپرس کے حرارت حاصل کرنے کا طریقہ عدسوں کے اصول پر کام کرتا ہے۔ کسی عدسے سے جب شعاعیں گزاری جائیں تو جس جگہ یہ شعاعیں ایک نقطہ پر جمع ہو رہی ہیں، وہاں کاغذ رکھ دیا جائے تو کاغذ جل جاتا ہے۔ یہی اصول استعمال کرتے ہوئے یہ تتلی اپنے پروں کو سورج کے سامنے خاص زاویے پر پھیلا دیتی ہے۔ شعاعیں اس کے حرارت حاصل کرنے والے حصوں پر جمع ہو جاتی ہیں۔ جب اس کا جسم مطلوبہ درجہ حرارت حاصل کر لیتا ہے تو یہ مائل پرواز ہو جاتی ہے۔ ہے نا عجیب بات!

کیا اور رومال دور رکھتے ہوئے آفتاب کی طرف بڑھا دیا... آفتاب نے بھی ناک کو دور رکھتے ہوئے رومال کو پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا... لیکن اتفاق کی بات کہ رومال نیچے گر گیا... اس سے پہلے کہ آفتاب رومال اٹھاتا، ایک بلی سردار ہارون کی مسہری کے نیچے سے تیر کی طرح آئی اور رومال پر جھک گئی... شاید وہ اُسے کوئی کھانے کی چیز سمجھی تھی... پھر وہ بوکھلا کر پیچھے ہٹی، لیکن اپنے پیروں پر کھڑی نہ رہ سکی... پٹ سے گری اور تڑپنے لگی... اس دوران آفتاب رومال اٹھا چکا تھا... اس نے اور آصف نے بلی کو تڑپتے دیکھا تو ان کی سٹی گم ہوگئی... کلوروفارم کو سونگھنے والا تڑپتا نہیں، فوراً بے ہوش ہو جاتا ہے، اسے ہلنے جلنے کا موقع ہی نہیں ملتا، لیکن یہ بلی تھی کہ تڑپ رہی تھی... آفتاب اور آصف کی حیرت کا کیا پوچھنا، پھر دیکھتے ہی دیکھتے بلی کے جسم میں تھرتھراہٹ دوڑ گئی... چند سیکنڈ تک تھرتھری جاری رہی، پھر وہ بالکل ساکت ہوگئی... دونوں نے خوف زدہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا... آفتاب نے جھک کر بلی کے جسم کو چھو کر دیکھا... ایک خوف ناک حقیقت ان کا منہ چڑا رہی تھی... بلی مر چکی تھی... وہ انسانوں کے قاتل بننے سے بال بال بچے تھے...

O

کتنے ہی سیکنڈ گزر گئے... دونوں پتھر کا بت بنے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے... کمرے میں موت کا ہولناک سناٹا طاری رہا... آخر آفتاب نے سرگوشی کی:

''یار، یہ تو مر گئی۔''

''ہاں، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مر چکی ہے... خدا نے ہمیں قاتل بننے سے بچا لیا ہے... اس کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔'' آصف بولا۔

''اس کا مطلب ہے، شابو نے ہمیں دھوکا دیا، اس نے ہمیں ایک فرضی کہانی سنا کر اس کام پر تیار کیا تھا، دراصل وہ سردار ہارون اور ان کی بیگم کو موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا ہے، سوال یہ ہے کہ وہ ایسا کیوں چاہتا ہے؟''

''یہ تو ہم بعد میں دیکھیں گے، وہ ایسا کیوں چاہتا ہے، پہلے ذرا اس تجوری کو کھول کر دیکھ لیں، کیا واقعی اس میں کوئی تصویروں والا لفافہ موجود ہے۔'' آصف نے کہا۔

''شابو کا بیان غلط ثابت ہو جانے کے بعد اب تجوری میں لفافے کا کوئی امکان ہی نہیں رہ جاتا۔'' آفتاب نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

''لیکن ہم یہاں آ ہی چکے ہیں، دیکھ لینے میں کیا حرج ہے؟'' آصف نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''خیر یونہی سہی۔'' آفتاب نے کندھے اچکائے۔

آصف نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا اور باری باری چابیاں آزمانا شروع کیں... تجوریوں کے لیے ان کے پاس خاص چابیوں کا ایک گچھا تھا جو وہ ساتھ لائے تھے... چابیاں لگتی جا رہی تھیں، لیکن تجوری کھلنے کا نام نہیں لے رہی تھی...

آصف کی پیشانی پر بل پڑ گئے، یہ دیکھ کر آفتاب بولا: ''لاؤ چابیاں مجھے دو۔''

''کیا تم سمجھتے ہو کہ میں چابیوں کو غلط طریقے سے لگا رہا ہوں۔'' آصف نے بھنا کر کہا۔

''نہیں، تم درست طریقے سے لگا رہے ہو، ذرا میں غلط طریقے سے لگا کر دیکھوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے چابیاں اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیں اور تجوری کے سوراخ پر جھک گیا... اس نے بھی باری باری تمام چابیاں لگا کر دیکھ لیں... مایوس ہو کر پیچھے ہٹنے ہی والا تھا کہ اچانک اس کی نظر دائیں ہاتھ لگے ہینڈل پر پڑی... اس ہینڈل کی بناوٹ اسے کچھ عجیب سی لگی، بے خیالی میں اُسے ٹٹولا تو اس کے اندرونی سمت میں ایک بٹن سا دبتا محسوس ہوا... اس پر جوش کی کیفیت طاری ہوگئی... اس نے بائیں ہاتھ سے چابیاں لگانا شروع کیں اور دائیں سے بٹن دبائے رہا... اچانک کلک کی آواز آئی:

''وہ مارا۔'' آفتاب نے کپکپاتی آواز میں کہا اور ہینڈل پکڑ کر کھینچ لیا...

تجوری کے دونوں پٹ کھل گئے... ساتھ ہی اُن کی نظر تجوری کی سامنے والی دیوار پر پڑی... وہاں ایک بڑی سی تصویر موجود تھی... سردار ہارون کی تصویر، اس کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ تھی... تصویر بالکل روشن تھی، جیسے کسی ٹی۔وی کی سکرین پر ہو... ابھی وہ حیرت بھری نظروں سے تصویر کو دیکھ ہی رہے تھے کہ حیرت کا دوسرا پہاڑ ان پر ٹوٹا... اسی وقت تصویر کے ہونٹ ہلے اور یہ الفاظ ان کے کانوں سے ٹکرائے:

''خبردار، تجوری کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانا، ورنہ تمہارے پرخچے اڑ جائیں گے۔''

(جاری ہے)

لینڈ کروزر

ف۔ح۔ کراچی

"چار سموسے دینا دو پلیٹوں میں۔" اس کا ہنستا مسکراتا چہرہ دیکھ کر میں چند منٹ کے لیے خود کو بھول گیا۔ وہ سفید رنگ کی چمکتی ہوئی لینڈ کروزر میں تھا۔ اس کا بڑا بھائی گاڑی چلا رہا تھا۔ شیشہ کھول کر اس نے جیسے ہی چار سموسوں کا کہا تو اندر سے ائیر کنڈیشنر کی ٹھنڈی ہوا میرے سموسوں کی دکان کی فضا کو مہکاتی چلی گئی۔

"دیکھ کیا رہا ہے بھائی۔ چار سموسوں کا تو بولا ہے۔"

"ج... ج... جی صاحب جی، مم... میں... اب، ابھی دیتا ہوں۔" وہ نوجوان لڑکا میری گھبراہٹ پر ہنس دیا۔ میرے ہاتھ مہارت سے چلنے لگے۔

"سموسے والے... تم مجھے گھور کیوں رہے تھے۔" وہ کروڑ پتی باپ کا بیٹا ہو کر ذرا بھی مغرور نہیں تھا۔ اتنی بے تکلفی سے مجھ سے پوچھا تو میری گھبراہٹ آہستہ آہستہ ختم ہوگئی۔

"صاحب جی! آپ اتنے بڑے آدمی ہیں۔ آپ بڑے بڑے ہوٹلوں میں کھانے والے ہیں، میں تو عام سموسے والا ہوں۔"

"تجھے کیا معلوم تیرے ہاتھوں میں کتنا ذائقہ ہے۔"

"صاحب جی! آپ میرا دل رکھ رہے ہیں۔" میں نے ان کی پلیٹیں صاف کر کے اس میں بڑی مہارت سے سموسے رکھے، اس میں چنے ڈالے۔ انھوں نے سامنے والی دکان سے بوتلیں منگوائیں اور گاڑی میں بیٹھ کر سموسے کھائے۔ ساتھ ساتھ وہ قہقہے لگا رہے تھے۔ کبھی کوئی بات ہوتی تو گاڑی کا شیشہ کھول کر میری تائید لیتے۔ میں ڈرتے ہوئے تھوڑا سا چٹکلہ چھوڑ دیتا، جس پر وہ خوب ہنستے۔

○

میں کوئی ان پڑھ اور جاہل نہیں تھا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کر چکا تھا۔ کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے، مجھے فوری نوکری کی ضرورت پڑی تو کہیں بھی نوکری نہ مل سکی۔ حالات ایسے تھے، میں نے اپنے ہی محلے میں سموسے پکوڑے کی ریڑھی لگا لی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ میرے ہاتھ میں قدرت نے انتہا کا ذائقہ رکھا ہے۔ ہمارے محلے کی ساری کرکٹ ٹیم، فٹ بال ٹیم کے لڑکے، کھیل کر سیدھے میرے پاس آتے اور سموسوں کے ساتھ انصاف کرتے تھے۔ میرا اچھا خاصا کام بن جاتا تھا۔ رفیق میرا بہت ہی سمجھ دار دوست تھا۔ اسی کے مشورے سے میں نے یہ ریڑھی والا کام شروع کیا تھا۔ وہ روز آتا، مجھے میری خوبیاں اور خامیاں سمجھاتا۔ اس کے مشوروں سے میری ریڑھی اب دکان میں تبدیل ہو چکی تھی۔ لوگ دفتر سے واپس آتے تو گھر والوں کے لیے گرما گرم سموسے لے کر جاتے۔ میں نے اپنی پڑھائی کے سارے گُر، اس دکان پر لگا دیے۔ دن بدن دکان بڑھنے لگی۔

"یار رفیق! مجھے تم سے کوئی بات کرنی ہے۔" میں نے اپنے ذہن کا بوجھ رفیق کو سنانے کا فیصلہ کر لیا۔

"ہاں بھئی بتاؤ۔"

"بھائی! میں امیر کب بنوں گا؟" رفیق میرا سوال سن کر خاموش ہوگیا۔

"ابھی تم غریب ہو؟" کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

"تو اور کیا... میرے پاس موٹر سائیکل بھی نہیں ہے، سادہ سی گاڑی بھی نہیں ہے، اتنا پڑھ لکھ کر لوگ دفتر کے اندر ائیر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھ کر کام کرتے ہیں، میں چولہے کے سامنے اپنا خون جلا کر سموسے بیچتا ہوں... اور پھر بھی میری حالت ویسی کی ویسی ہے۔" ابھی یہ بات کہی تھی کہ وہی لینڈ کروزر آ کر کھڑی ہوگئی۔ پندرہ سالہ خوب صورت نوجوان کاشف کی آواز آئی۔

"ہاں استاد چار لگا دے ذرا جلدی سے کہیں شادی پر جانا ہے۔" لینڈ کروزر کا شیشہ کھلتے ہی ائیر کنڈیشنر کی ٹھنڈی ہوا ہم دونوں پر پڑی۔ میرے ہاتھ تیزی سے چلنے لگے۔ میں نے ان دونوں کے لیے شیشے کی پلیٹیں خریدی تھیں۔ جلدی سے بھاگ کر بوتلیں پکڑیں اور ان دونوں کو دیں۔ ساتھ ہی میری سوچوں کا پہیہ گھومنے لگا۔ کاش میرے پاس بھی دولت ہوتی۔ میں بھی اس طرح مال و دولت سے بے پروا ہو کر رہتا اور نہ جانے کیا کچھ سوچتا رہا۔ اتنی دیر میں وہ پلیٹوں کے ساتھ انصاف کر چکے تھے۔ حسبِ معمول انھوں نے پلیٹیں باہر رکھیں اور سو روپے کا نوٹ میری طرف اچھالا اور باقی لیے بغیر گاڑی اسٹارٹ کی اور چند قدم آگے بڑھے، اچانک بریک لگائی، گاڑی واپس موڑی، شیشہ کھولا اور مجھے آواز دی، میں نے ان کی طرف دیکھا تو کاشف نے چشمہ اوپر کر کے مجھے آنکھ ماری اور آگے بڑھ گئے۔ رفیق یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔

○

رفیق مجھے بہت سمجھانے کی کوشش کرتا تھا مگر میری سوچ چم چم کرتی سفید لینڈ کروزر پر اٹک جاتی تھی۔ کاشف اور اس کے بھائی عثمان سے میری دوستی پکی ہوتی گئی، کیونکہ یہ روز آ کر سموسے کھاتے، انھوں نے میرا موبائل نمبر لے لیا۔ دو تین دن بعد مجھ سے گپ شپ بھی کرتے۔ وہ انتہائی امیر کبیر لیکن بہت ہی سلجھے ہوئے لڑکے تھے۔ رفیق بہت کوشش کرتا کہ مجھ سے یہ احساس ختم ہوجائے۔ رات جب بستر پر جاتا تو تین بہنوں کی شادیوں کا مسئلہ، شادی شدہ بہن کے ہاں لڑائی کا مسئلہ، چھوٹے بھائی کے تعلیمی اخراجات کا مسئلہ، بستر میں میرے ساتھ ہوتے۔ ان مسائل کے ساتھ کاشف کی لینڈ کروزر، اُن کے ائیر کنڈیشنڈ بنگلے مجھے میری غربت کا احساس دلاتے۔

○

"اے بھائی... چار سموسے لگا دے... شاباش جلدی۔" ساتھ ہی ایک مخصوص آواز آئی اور گاڑی بند ہوگئی۔ کاشف کے بھائی نے بہت کوشش کی کہ اسٹارٹ ہو جائے، مگر ہوئی نہیں۔ گاڑی کے بند ہوتے ہی ائیر کنڈیشنر بند ہوگیا۔

"ہم دھکا لگا دیں؟"

"نہیں بھائی! یہ آٹو میٹک گاڑی ہے، دھکے سے اسٹارٹ نہیں ہوگی۔" ساتھ ہی اس نے فون ملایا۔ ملازم کو بتایا کہ اس جگہ پہنچ جاؤ۔ اتنی دیر میں ان دونوں نے گاڑی میں بیٹھ کر خوب گپ شپ لگائی۔ بیس منٹ بعد ڈرائیور ایک نئی کرولا کار لے کر آ گیا۔ گاڑی لینڈ کروزر کے پاس روکی۔ لیکن (باقی صفحہ 10 پر)

رہائی

شازیہ نور - لاہور

میں نے ایک بھاری پتھر اٹھایا اور اس کے سر پر دے مارا۔

تقریباً چھ سال پہلے میں اپنے والدین اور دو چھوٹے بہن بھائیوں کے ساتھ اپنے گاؤں مسلم آباد میں مقیم تھا۔ ابا جان کی گاؤں میں چند ایکڑ زمین تھی، جس پر وہ فصلیں کاشت کرتے تھے۔ اللہ کے فضل اور ابا جان کی محنت اور دعاؤں کا ثمر تھا کہ ہماری زمین کی فی ایکڑ پیداوار گاؤں کی باقی زمینوں سے زیادہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ گاؤں کا بڑا چوہدری خورشید ہماری زمین کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا تھا اور ابا جان سے کئی مرتبہ زمین خریدنے کا ذکر بھی کر چکا تھا، لیکن ابا جان کی روزی روٹی اسی زمین سے وابستہ تھی۔ وہ کسی قیمت پر بھی یہ زمین بیچنے کو تیار نہ تھے۔

حسد کی آگ چوہدری خورشید کے دل میں بڑھتی جا رہی تھی اور ایک روز اس نے زمینوں پر پانی لگانے کے بہانے اپنے خاص آدمی بھیجے اور انھوں نے جان بوجھ کر لڑنا شروع کر دیا۔ ابا جان نے سمجھانے کی کوشش کی تو ایک شخص نے پستول نکالا اور دو گولیاں ابا جان کے سینے میں اتار دیں۔ زخموں کی تاب نہ لا کر ابا جان فوت ہو گئے۔ امی جان پر تو سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ میری عمر اس وقت صرف سترہ سال تھی اور میرا بھائی چودہ سال کا اور بہن دس سال کی تھی۔ شہر سے ماموں جان آ گئے تو انھوں نے امی کو سنبھالا۔ چند دن ہی گزرے تھے کہ چوہدری نے گاؤں کے کچھ لوگوں کے ذریعے پھر سے زمین خریدنے کا ارادہ ظاہر کیا اور کچھ رقم امداد کے لیے بھی بھیجی۔ مجھے امی اور ماموں کو یقین تھا کہ چوہدری نے ہمارے ابا جان کو قتل کروایا ہے، لیکن ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے چوہدری پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔ اگر چوہدری کے خلاف کیس کرایا بھی جاتا تو چوہدری اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے صاف بچ نکلتا۔ اس لیے دل میں غم و غصہ کو قابو کر کے ماموں نے زمین بیچنے کا مشورہ دیا۔ ویسے بھی اب زمین کی دیکھ بھال ہمارے بس کی بات نہیں تھی۔

ماموں نے چوہدری خورشید سے تمام معاملات طے کیے اور اس رقم سے شہر میں ہمارے لیے ایک مکان اور ضرورت کا سامان خرید لیا۔ اب صرف ہمارے جانے کی دیر تھی۔ وہ اتوار کا روز تھا جب ماموں ہمیں شہر لے جانے کے لیے گاڑی لے آئے۔ گھر کا سامان گاڑی میں رکھا اور ہم لوگ بھی گاڑی پر سوار ہو گئے۔ راستے سے گزرتے ہوئے ہمارا گزر ہمارے کھیتوں پر سے ہوا تو میں نے ضد کی۔

''ماموں بس دو منٹ میں اپنے کھیتوں پر ایک نگاہ ڈال کر آتا ہوں۔'' امی کی آنکھیں بھی ڈبڈبا رہی تھیں۔ ماموں نے گاڑی روک لی۔ میں گاڑی سے اترا اور باہر آ کر اپنے سے جدا ہو جانے والے کھیتوں پر گہری نظر دوڑانے لگا۔ اچانک میری نظر چوہدری خورشید کے بیٹے حمید پر پڑی۔ حمید نے بھی میری طرف دیکھا اور بڑے غرور کے ساتھ کھیتوں پر نظر ڈال کر زہریلی مسکراہٹ اپنے چہرے پر سجائے، وہ میرے تاثرات دیکھنے لگا۔ میرا خون کھول اٹھا۔ وہ میرے باپ کے قاتل کا بیٹا تھا اور اس کھیت پر قبضہ کرنے کے لیے ہی تو اس کے باپ نے میرے معصوم باپ کو مروایا تھا۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں نے اپنے قریب پڑا ایک پتھر اٹھایا اور اس پر پوری طاقت سے دے مارا۔ پھر میں نے خون کا ایک فوارہ نکلتے دیکھا اور میں وہاں سے بھاگ کر جلدی سے گاڑی میں آ بیٹھا۔ ماموں میری یہ ساری کارروائی دیکھ چکے تھے وہ غضب ناک ہو کر بولے: ''یہ کیا کر آئے ہو بے وقوف؟'' اس کے ساتھ ہی انھوں نے گاڑی چلا دی اور تیزی سے گاؤں سے نکل آئے۔

''اب چوہدری تمہاری جان کا دشمن بن جائے گا، وہ اپنے بیٹے کی موت کا بدلہ تم سے ضرور لے گا۔'' ماموں غصے سے بول رہے تھے۔

''تو! تو کیا حمید مر گیا ہو گا؟'' میں کانپ اٹھا۔

''وہ مرے یا نہ مرے مگر اب تم بچ کر رہنا، جہاں کہیں چوہدری کا کوئی نوکر یا جاننے والا نظر آئے، اپنے آپ کو اس سے بچا کر رکھنا، وہ تو شکر ہے کہ اسے خبر نہیں کہ ہم جا کہاں رہے ہیں، ورنہ وہ ہمارا شہر میں رہنا محال کر دیتا۔'' ماموں جان نے میرے دل میں چوہدری خورشید کا ڈر ایسا پیدا کر دیا تھا کہ میں واقعی بہت محتاط ہو گیا۔ شہر میں ماموں نے مجھے ایک چھوٹی سی دکان کرایہ پر لے دی تھی جہاں میں مرچ مصالحے بیچا کرتا تھا۔ ساتھ ساتھ میں پڑھائی بھی کر رہا تھا۔ آج میں کچھ سامان خریدنے بڑی مارکیٹ گیا تھا۔ سودا خریدنے سے پہلے ہی ایک دکان پر مجھے حمید نظر آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے ماموں کے الفاظ یاد آ گئے کہ چوہدری اب تمہاری جان کا دشمن بن جائے گا۔ حمید نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور میری ہی طرف بڑھ رہا تھا۔ بس پھر کچھ سوچے سمجھے بغیر میں بھاگ کھڑا ہوا۔ مجھے نہیں معلوم حمید نے میرا تعاقب کہاں تک کیا۔ میں اب تھک گیا تھا۔ ایک سوچ کے ساتھ ہی میرا خوف دور ہو گیا تھا کہ جب حمید مرا ہی نہیں تو میں اس کا قاتل کیسے بن گیا، بلکہ اب بھی وہ میرے باپ کے قاتل کا بیٹا تھا۔ مجھے اپنے اوپر ہنسی آ رہی تھی اور غصہ بھی۔

چند دن گزرے تھے کہ حمید مجھے ڈھونڈتا ہوا میری دکان تک پہنچ ہی گیا۔ میں حیران تھا کہ وہ یہاں تک کیسے پہنچا۔ شاید وہ مجھ سے اس پتھر کا بدلہ لینا چاہتا تھا جو میں نے اس کے سر پر مارا تھا۔ ایک مرتبہ پھر خوف کی کیفیت میرے بدن میں سرایت کر گئی۔

''عبداللہ! ذرا میری بات سن لو۔'' انتہائی نرم لہجے میں اس نے میرا نام لے کر مجھے پکارا تو مجھے یوں لگا کہ شاید میں خواب دیکھ رہا ہوں۔

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''عبداللہ! میں معافی مانگنا چاہتا ہوں۔'' وہ التجا کر رہا تھا۔

''معافی؟'' میں حیرت زدہ رہ گیا۔

''ہاں عبداللہ! میرے باپ نے تمہارے باپ کا قتل کروایا تھا، لیکن میرے سگے

چچانے محض زمین کے لیے انھیں قتل کر دیا، میں تمہارے پتھر مارنے کی وجہ سے تم سے بدلہ لینا چاہتا تھا، لیکن جب میرے چچانے میرے باپ کو قتل کر دیا تو میرے دل میں چچا کے لیے جو غصہ تھا، اس نے مجھے احساس دلایا کہ تم نے مجھے کیوں پتھر مارا، میرا چچا تو پکڑا گیا، اسے تو سزا مل گئی مگر میرا باپ بغیر سزا کے ہی دنیا سے چلا گیا، البتہ مرنے سے پہلے اس نے اپنے گناہ کا اعتراف کیا اور مجھے وصیت کی کہ میں تمھیں تلاش کر کے معافی مانگوں اور تمہاری زمین میں مزید زمین ملا کر تمھیں واپس کر دوں، تاکہ اُسے قبر میں سکون مل سکے۔ اللہ کے لیے عبداللہ معاف کر دو میرے باپ کو۔ اسے سزا بھگتتے چھ سال گزر گئے ہیں۔ اسے رہائی دلا دو میرے بھائی۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا اور میں بے یقینی کی کیفیت میں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

بقیہ: لینڈ کروزر

کاشف لینڈ کروزر سے نیچے نہیں اترا۔ ملازم نے اس کی طرف کا دروازہ کھولا اور اسے کندھوں پر اٹھالیا۔ میں یہ منظر دیکھ کر چکرا گیا۔ اگر رفیق مجھے سہارا نہ دیتا تو میں یقیناً زمین پر گر جاتا۔ کاشف کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں کے اوپر سے کٹی ہوئی تھی۔ وہ چلنے پھرنے سے معذور تھا، لیکن آج تک اس کے چہرے اور اس کی باتوں سے یہ اندازہ نہیں ہوسکا تھا کہ وہ معذور ہے۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کار آگے بڑھی۔

''اوہ... پیچھے موڑو۔'' یہ کاشف کی شگفتہ سی آواز تھی۔ گاڑی میری ریڑھی کے پاس آئی۔

''ہیلو... سموسہ والا۔'' میں نے اس کے مسکراتے چہرے کو دیکھا، اس نے جھٹ سے آنکھ ماری اور کار آگے بڑھ گئی۔ میں اس کی اس ادا پر مسکرا کر رہ گیا۔ میں اپنی ٹانگوں کی قیمت جان چکا تھا۔ ان کی قیمت یقیناً سامنے کھڑی لینڈ کروزر سے کروڑوں گنا زیادہ تھی۔

''ہیلو مسٹر کروزر... گاہکوں کو سموسے دو۔'' رفیق نے میرا کندھا ہلایا۔

''جی نہیں... مسٹر ٹانگیں کہو... لینڈ کروزر کو مارو... میزائل۔'' میرے جواب پر وہ بے اختیار مسکرا دیا۔

اچانک موت

عبدالسلام زرگر۔ شہر سلطان

انسان کی زندگی بھی بڑی عجیب گزرتی ہے۔ پیدا کہیں اور ہوتا ہے، موت کہیں اور آتی ہے اور جب آتی ہے تو بتا کر نہیں آتی۔ اچانک موت آجاتی ہے۔ اس لیے ہر انسان اپنے آپ کو تیار رکھے۔ نہ جانے کب بلاوا آجائے۔ ایسا نہ ہو جب دنیا سے جانا ہو تو ہاتھ ملتے رہ جائیں اور کچھ نہ کر سکیں۔ بڑی شدید گرمی کا موسم تھا، یعنی جون کا مہینا تھا۔ ہمارے بہنوئی صاحب کے والد صاحب کا انتقال ہوا۔ دوتالہ جانا تھا اور جب چلے تو قدرتی طور پر شناختی کارڈ گھر پر رہ گیا۔ گجر خان پہنچے۔ چائے پینے کے لیے نیچے اتر گئے۔ منہ ہاتھ دھویا اور چائے پی۔ کچھ دیر بعد دل کے مقام پر درد سا محسوس ہوا، پھر اچانک کھڑے ہوئے اور لہرا کر نیچے گر گئے۔ دکان والوں نے انھیں اٹھایا تو ان کی روح پرواز کر چکی تھی۔ اللہ جل شانہٗ ان لوگوں کا بھلا کرے۔ انھوں نے فوراً انھیں اٹھایا اور قریبی ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے چیک کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، انھیں دل کا اٹیک ہوا ہے۔ لوگ اکٹھے ہو گئے۔ ان کی تلاشی لی تو رقم کے علاوہ کچھ نہ ملا۔ شناختی کارڈ گھر پر رہ گیا تھا۔ بڑے پریشان تھے کہ اب کیا کریں۔ آخر کار انھوں نے اخبار والوں کو خبر دی۔ اخبار والوں نے ان کی تصویر بنائی اور خبر لگا دی، تاکہ کوئی دیکھے تو وارث اپنی میت کو لے جائیں مگر اللہ جل شانہٗ کی شان، اللہ کا کرنا ایسا ہوا اس دن کسی نے اخبار نہ پڑھا۔

ایک تو تصویر اتنی واضح نہیں تھی کہ لوگ فوراً پہچان جاتے۔ تین دن کا انتظار کر کے انھیں دفن کر دیا گیا۔ پھر بیس دن گزرنے پر گھر والوں کو پریشانی ہوئی کہ نہ خیر خبر، نہ اطلاع، تو گھر والوں نے دوتالہ فون کیا کہ علی نواز پہنچ گیا۔ فون نہیں کیا۔ اُدھر سے جواب آیا۔ ادھر تو آئے ہی نہیں اور پوچھا، بھائی صاحب کب چلے تھے۔ گھر والوں نے بتایا کہ کب چلے نہیں، بلکہ آج بیس دن گزر چکے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ گھر والوں کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اُدھر دوتالے والے، ادھر گھر والے بہاول پور میں دونوں طرف بھاگ دوڑ شروع ہوگئی۔ آخر کار پوچھتے پوچھتے ایک آدمی نے اطلاع دی کہ اخبار میں خبر آئی تھی، یہ وہ ہی نہ ہوں، پھر اخبار کی تلاش شروع ہوئی۔ اخبار ملا تو تصدیق ہوگئی۔ پھر نیا اخبار والوں سے رابطہ کیا تو پتا چلا یہ خبر گجر خان سے لگی ہے۔ تصدیق کے لیے فون کیا گیا۔ جواب ملا، جی ہاں یہ بندہ گجر خان میں ہی فوت ہوا۔ یہیں دفنایا گیا ہے۔ آپ لوگ باقی معلومات کمیٹی والوں سے لے لیں۔ اُن سے پوچھا گیا تو بتایا گیا کہ ہم نے تین دن تک انتظار کیا تھا۔ پھر دفن کرایا تھا۔ آپ لوگ یہاں آکر اُن کی قبر کو دیکھ سکتے ہیں۔ اگر چاہیں تو اپنی میت کو نکال کر لے جاسکتے ہو جب مکمل معلومات ہوگئیں تو گھر میں کہرام مچ گیا۔ گھر میں بچیاں بہت روئیں پھر ایک بچی نے کہا، میں اپنے باپ کی لاش یہیں بہاول پور میں دفن کراؤں گی۔ سب نے منع کیا، میں نے بھی روکا، ان کی لاش کو اب قبر سے نہ نکالو۔ بچی نہ مانی۔ آخر کچھ افراد بہاول پور سے روانہ ہوئے اور گجر خان پہنچے۔ تابوت بنوایا اور قبر پر پہنچے۔ کمیٹی والوں کی نگرانی میں چار بندوں نے قبر کو کھولا، اللہ کی پناہ اتنی بدبو تھی کہ ہمارے دماغ اور اعصاب جواب دینے لگے۔ بڑی مشکلوں سے انھیں قبر سے نکالا اور جلدی سے انھیں تابوت میں ڈال دیا اور مکمل بند کر دیا۔ صرف چہرے کے اوپر شیشہ لگا ہوا تھا آخر یہ لوگ بہاول پور پہنچے اور انھیں پھر سے دفن کیا گیا۔

شہد کے فوائد

صبا بنتِ محمد اسماعیل۔ رائیونڈ

ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شہد بہت پسند تھا۔ آپ کو شہد اس لیے پسند تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس میں شفا ہے، شہد کھانے کے بے شمار فوائد ہیں۔

1. شہد کا مسلسل استعمال انسان کو بڑھاپے سے بچاتا ہے۔
2. نہار منہ شہد چاٹنے سے بلغم دور ہو جاتی ہے۔
3. شہد معدہ کو صاف کرتا ہے۔
4. شہد دماغ کو قوت دیتا ہے۔
5. شہد فالج اور لقوہ میں بھی مفید ہے۔
6. شہد آنکھوں میں لگانے سے آنکھوں میں چمک پیدا ہوتی ہے۔
7. شہد چہرے کی رنگت کو نکھارتا ہے۔
8. شہد دستوں کی بیماری میں بھی مفید ہے۔
9. شہد کو اخروٹ کے ساتھ کھانے سے معدہ کی سردی دور ہو جاتی ہے۔
10. جب بچوں کے دانت نکل رہے ہوں تو ان کے مسوڑھوں پر شہد ملتے رہنے اور شہد چٹانے سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔ غرض کہ اللہ تعالیٰ نے بے شمار بیماریوں کے علاج میں شہد کو شفا بخشی ہے۔

پُرانا رجسٹر

''ملازمت کے لیے آنے والے چوتھے امیدوار پر جیسے ہی نظر پڑی، میں بری طرح چونک پڑا۔ ادھر آنے والا بھی چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ میں بغیر پلکیں جھپکائے اسے دیکھنے میں محو تھا۔

''کتنا تبدیل ہوگیا ہے عارف۔'' میں نے دل میں سوچا اور اس نام کے ساتھ ہی ایک سات سال پہلے کی کہانی لمحوں میں میرے ذہن میں گھوم کر ختم ہوگئی۔ آخر اس کے اجازت لینے پر میں خیالات کی دنیا سے نکلنے پر مجبور ہوگیا۔

''جی آیئے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے ٹیبل کے دوسری طرف رکھی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ میرے بالکل سامنے والی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ دراصل بابا جان نے یہ انٹرویو والا کام میرے ذمہ لگا دیا تھا۔ فیکٹری میں دس ملازمین کی ضرورت تھی۔ اخبار میں اشتہار دینے پر آج بے شمار لوگ انٹرویو کے لیے حاضر تھے اور ایسے میں عارف سے ملاقات ہوگئی تھی۔ عارف میرا کلاس فیلو تھا۔ ہم نے ایف اے تک اکٹھے تعلیم حاصل کی۔ میرے اور اس کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ مگر ایف اے کے بعد اس نے تعلیم کو خیر باد کہا تو مجھے بھی جیسے خیر باد ہی کہہ دیا۔ اس کے بعد میں نے اپنی تعلیم جاری رکھی اور ابھی تقریباً تین سال پہلے ایم۔ اے کر کے فارغ ہوا تو بابا جان کے ساتھ اپنی فیکٹری میں ہی کام کرنے لگا۔

''کیسے ہو عارف؟'' یہ ملازمت کے لیے انٹرویو کا سوال ہرگز نہیں تھا، بلکہ یہ تو میں نے اس سے کلاس فیلو ہونے کے ناطے سوال کیا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں! تم سناؤ کیسے ہو؟'' عارف کی آواز انتہائی دھیمی تھی۔ دکھ کی ایک لہر میرے پورے جسم میں سرایت کر گئی۔ عارف ایک انتہائی خوش اخلاق لڑکا تھا مگر آج اس کے چہرے کے ساتھ ساتھ آواز سے بھی پریشانی جھانک رہی تھی۔

''ٹھیک ہو؟ مگر مجھے تو ٹھیک نہیں لگ رہے۔'' وہ خاموش رہا۔

''بتاؤ ناں عارف پلیز! کیا پریشانی ہے؟ کالج چھوڑنے کے بعد تم کہاں غائب ہوگئے تھے؟'' وہ پھر خاموش تھا۔

''عارف؟'' میں نے اسے جیسے ہوش میں لانے کے لیے کہا۔ اس نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پھر اس کے لب حرکت کرنے لگے۔

''یہ بات تو تمھیں یاد ہوگی کہ بابا جان کو دل کا دورہ پڑنے کے بعد کاروبار ٹھپ ہوگیا تھا۔ مجھے مجبوراً تعلیم کو خیر باد کہنا پڑا تھا۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

بینا رانی۔ ملتان

''میں نے کاروبار سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکا۔ چند ماہ بعد ابا جان کا انتقال ہوگیا۔ اس صدمہ نے مجھے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ کاروبار ختم ہی ہوگیا تھا۔ جب تنگی ہونا شروع ہوئی تو میں نے ملازمت ڈھونڈنا شروع کی اور اس دن سے آج تک بیسیوں جگہ انٹرویو دے چکا ہوں مگر۔'' عارف کی آواز ایک دم رندھ گئی۔ وہ خاموش ہوگیا اور میں ماضی میں کھو گیا۔

''اُردو کے استاد جناب منیب قریشی صاحب نے استاد پر مضمون لکھنے کو کہا تھا۔ سب طالب علموں کے مضمون ٹیبل پر جمع تھے۔ سر چیک کر رہے تھے۔ ایسے میں ایک رجسٹر اُٹھا کر انھوں نے ہوا میں لہرایا اور بڑے کرب ناک انداز میں گویا ہوئے۔

''یہ رجسٹر جس طالب علم کا بھی ہے میں نام نہیں جاننا چاہتا، مگر اتنا ضرور کہتا ہوں کہ وہ کامیاب زندگی نہیں گزار سکے گا۔'' اور یہ رجسٹر تھا عارف کا۔ ان کے چلے جانے کے بعد سب لڑکے عارف کے رجسٹر پر جھک گئے۔ عارف نے استاد پر مضمون لکھنے کے دوران شوخی میں لکھ دیا تھا:

دردِ سر کے واسطے پیدا کیا اُستاد کو
ورنہ پڑھانے کے لیے کم نہ تھیں اُستانیاں

عارف کا شمار ہماری جماعت کے لائق طلبہ میں ہوتا تھا مگر سب نے دیکھا کہ اس سال امتحان میں وہ صرف واجبی نمبروں سے پاس ہوا اور اس نے تعلیم کو خیر باد کہہ دیا۔

''کیا سوچنے لگے فرخ؟'' عارف کی آواز نے مجھے پھر ماضی سے حال میں لا کھڑا کیا اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی اسے وہ دن یاد کرا بیٹھا۔ ساری بات یاد کر کے اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ اتنے عرصہ میں اس کا ذہن ایک بار بھی اس طرف نہیں گیا تھا مگر آج مارے شرمندگی کے اس کی نظریں زمین میں گڑ کر رہ گئی تھیں۔

''اب! اب کیا کروں۔ سر سے معافی مانگ لوں۔ پر سر تو جانے کہاں ہوں گے؟''

''میرا رابطہ ہے سر سے۔''

''کیا واقعی؟'' وہ خوشی اور بے یقینی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ بولا۔

''ہاں میرے پاس ان کا پتا بھی موجود ہے۔ تم کوشش کرو۔ وہ بہت اعلیٰ اخلاق کے مالک ہیں۔ تمھیں ان شاء اللہ ضرور معاف کر دیں گے اور دعائیں بھی دیں گے۔'' یہ کہہ کر میں نے سر منیب کا پتا لکھ کر اس کی طرف سرکا دیا۔ وہ چھلاوے کی طرح باہر کو دوڑ پڑا۔ دو دن کے بعد عارف کا فون آیا۔ اس کی آواز سے ہی اس کی خوشی کا اندازہ ہو رہا تھا۔

''میں نے سر منیب سے معافی مانگ لی ہے فرخ۔ انھوں نے خوش دلی سے معاف کر دیا ہے۔''

''واقعی؟'' ''ہاں واقعی۔''

''ہوں تو ٹھیک ہے! تم کل سے ملازمت پر آسکتے ہو۔''

''کیا!!!'' میری آواز سن کر وہ خوشی سے چلا اُٹھا۔ اگلے دن وہ آیا تو اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلملا رہے تھے۔

جواہرات سے قیمتی

- خوب صورتی کی کمی کو اخلاص پورا کر سکتا ہے، لیکن اخلاص کی کمی کو خوب صورتی پورا نہیں کر سکتی۔
- جس شخص سے قیامت کے دن فائدہ نہ ہو، اس کی صحبت سے کیا فائدہ
- نیکی کا تقاضا یہ ہے کہ اسے فوراً کیا جائے۔
- گناہ کا موقع نہ ملنا بھی اللہ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے اور موقع ملنے پر گناہ سے بچ جانا، یہ اللہ کا انعام ہے۔
- اذان کی آواز پر دکانیں بند نہیں ہوتیں۔ ایک گولی چل جائے تو بند ہو جاتی ہیں۔ یہ ہے اللہ کے خوف اور موت کے خوف کی مثال۔
- حقیقی کامیابی لگاتار محنت سے حاصل ہوتی ہے۔
- جب انسان اللہ سے دور ہو جاتا ہے تو سکون اس سے دور ہو جاتا ہے۔
- سکون کی جگہ خوف اور اندیشہ لے لیتا ہے۔
- ناامید ہونے سے عمر گھٹتی ہے۔
- جو بات معلوم نہ ہو، اس کے اظہار میں شرم نہیں کرنی چاہیے۔
- اگر تمھیں کسی چیز کا ڈر نہ ہو تو سمجھ جاؤ، تم راستہ بھول رہے ہو۔

ارسال کرنے والے: رابعہ عمر چکوال۔ محمد عدنان معاویہ روڈو سلطان۔ محمد سعید علوی چکوال۔ محمد خبیب قاسمی کوٹ سمابہ۔ حافظ محمد عمر فاروق سنانواں۔ ماریہ نور بنت عبدالعزیز، فریحہ اسلم کڑیال۔

کون بنے گا کروڑ پتی

حافظ حمزہ شہزاد۔ سرائے سدھو

میں نے کمپیوٹر سکرین پر ابھرے ہوئے الفاظ پڑھے اور غصے کے مارے میری مٹھیاں بھنچ گئیں۔ سخت سردی میں بھی میرے ماتھے پر پسینہ آگیا تھا۔ رومان نے لکھا تھا:

''یہودی فوجیوں نے ہمارے مکان کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ کوئی لمحہ نہیں جاتا جب وہ ہمارے مکان پر دھاوا بول دیں گے۔ اگر غلطی ہوگئی ہو تو معاف کردینا۔ زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔''

جواب میں میری انگلیاں تیزی سے کی بورڈ پر تھرکنے لگیں:

''دیکھو رومان! میں تم سے بہت دور پاکستان میں بیٹھا ہوں۔ میرا بس نہیں چل رہا کہ یہودی فوجیوں کو کاٹ پھینکوں۔''

''تم دل چھوٹا مت کرو۔'' رومان نے جواب لکھا: ''ایسے ظلم ہم روز سہتے ہیں، روز جیتے ہیں، روز مرتے ہیں، تم اپنا ای میل ایڈریس مجھے سینڈ کرو۔ موقع ملتے ہی میں تمہیں میل کروں گی۔ فیس بک والا یہ اکاؤنٹ شاید اب کبھی استعمال نہ کرپاؤں۔ ہمدردی کے لیے شکریہ!''

یہ میسج بھیجتے ہی وہ لاگ آؤٹ ہوگئی تھی، کیونکہ اسکی موجودگی کو ظاہر کرنے والا سبز نقطہ مٹ گیا تھا۔ رومان فلسطین کی رہنے والی میری فیس بک بہن تھی۔ اسکی دوستی کی درخواست کو قبول کیے صرف دس پندرہ دن ہی ہوئے تھے مگر یوں لگتا تھا جیسے اسے صدیوں سے جانتا ہوں، میں کافی دیر ایسے ہی بیٹھا اسرائیلیوں کے مظالم کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر بے بسی سے کندھے اچکا کر باہر نکل گیا۔

تقریباً ایک مہینے بعد مجھے ایک میل موصول ہوئی۔ یہ رومان کی طرف سے تھی۔ اس نے لکھا تھا:

''شہزاد بھائی! میں امریکہ کے ایک شہر میں ایک یہودی کی پناہ گاہ میں ہوں۔ یہ ایک نیک دل یہودی ہے۔ میرے باپ کا کسی زمانے میں بہت اچھا دوست تھا۔ یہاں پہنچ کر مجھ پر ظاہر ہوا ہے کہ میرا باپ ایک ارب پتی شخص تھا۔ ہاں شہزاد! اس رات یہودی کے حملے میں میرا باپ شہید ہوگیا تھا مگر میں کسی طرح فرار ہوکر اپنے باپ کے اس دوست تک پہنچنے میں کامیاب رہی۔ ہاں تو میں تمہیں بتا رہی تھی کہ میرے باپ نے میرے لیے بہت رقم چھوڑی ہے۔ میں بہت غیر یقینی حالات میں گرفتار ہوں۔ میں اپنی تمام رقم تمہارے اکاؤنٹ میں منتقل کروانا چاہتی ہوں۔ مجھے غلط مت سمجھنا۔ میں ایشیاء کے کسی بھی محفوظ ملک میں پہنچتے ہی اپنی رقم واپس لے لوں گی۔ اپنا اکاؤنٹ نمبر، بینک کا نام اور بینک کا فون نمبر لکھ رہی ہوں۔ آپ معلومات حاصل کرسکتے ہیں۔ میں بہت جلد موقع ملتے ہی رابطہ کروں گی۔'' آخر میں اس نے ایک پاس ورڈ بھی لکھا تھا جس کے ذریعے میں کمپیوٹر پر بیٹھے بیٹھے اس بینک کی ویب سائیٹ کھول کر اس کے اکاؤنٹ کے بارے میں معلومات حاصل کرسکتا تھا۔ میں نے اسی وقت انٹرنیٹ کے ذریعے معلومات حاصل کیں۔ وہ امریکہ کا مشہور بینک تھا۔ بینک کی شاخیں امریکہ کے ہر بڑے شہر میں موجود تھیں۔ میں نے مطلوبہ بینک کی برانچ کا نمبر ملایا۔ وہ بینک امریکہ کے ایک بڑے شہر میں واقع تھا۔ میں نے رومان کا اکاؤنٹ نمبر اور پاس ورڈ ملایا۔ جب میں اس کے اکاؤنٹ میں لاگ ان ہوا تو مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ رومان حقیقت میں کروڑ پتی لڑکی بن چکی تھی۔ اعداد و شمار ظاہر کرتے تھے کہ وہ کروڑوں ڈالر کی مالک ہے۔

اس رات سنجیدگی سے میں نے رومان کے بارے میں سوچا۔ میں نے ایک فیصلہ کیا اور سوگیا۔

پندرہ دن بعد اس کی ایک اور میل موصول ہوئی۔ اس نے لکھا تھا:

''شہزاد بھائی! آپ کی طرف سے مسلسل خاموشی کی وجہ سے میں سمجھ گئی کہ آپ کسی وجہ سے میری مدد نہیں کرسکتے۔ اس لیے میں نے دوسرے ذرائع استعمال کیے اور اس وقت بھارت کے ایک شہر میں موجود ہوں۔

تنویر نامی ایک مسلمان لڑکے نے میری مدد کی ہے۔ اس نے نہ صرف مجھے امریکہ سے نکالا بلکہ میری رقم کا ایک بڑا حصہ ٹرانسفر کروا کر ایک منافع بخش کاروبار میں سرمایہ کاری کی ہے۔ میں نے اپنا فیس بک کا نیا اکاؤنٹ بنایا ہے اور تمہاری آئی ڈی پر فرینڈ درخواست بھیجی ہے۔ میں رات نو سے گیارہ بجے تک آن لائن ہوتی ہوں۔''

میں نے اسی وقت اپنا فیس بک اکاؤنٹ کھولا۔ اس کی فرینڈ درخواست آئی ہوئی تھی۔ اس نے ''رومان تنویر'' کے نام سے درخواست بھیجی تھی: ''کیا اس نے تنویر سے شادی کر لی؟'' میں نے سوچا۔ رات کو جب وہ آن لائن ہوئی تو یہی سوال اس کے سامنے رکھا۔

''ہاں شہزاد بھائی!'' اس نے اقرار کیا: ''اس معاشرے میں عورت کے سر پر سائبان کا ہونا بہت ضروری ہے۔''

کچھ رسمی باتوں کے بعد اس نے لکھا: ''شہزاد بھائی! میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔''

میں چونک گیا۔ میری انگلیوں نے تیزی سے کی بورڈ پر حرکت کی: ''جی بتائیں۔''

''اپنی دولت کا بڑا حصہ میں نے کاروبار میں لگا دیا ہے۔'' اس نے لکھا: ''ایک تہائی حصہ میں نے فلسطین کی ایک تنظیم کو عطیہ کیا ہے اور باقی رقم میں اپنے مخلص دوستوں کو دینا چاہتی ہوں۔ آپ میرے بھائی بنے ہوئے ہیں۔ آپ کی باتوں نے مجھے بہت حوصلہ دیا۔ میں نے تھوڑی سی رقم آپ کے نام کی ہے۔ امریکہ میں ہی ایک وکیل اور بینک کے منیجر کو اجازت نامہ دے کر آئی ہوں۔ مطلوبہ نمبرز لکھ رہی ہوں۔ آپ ان سے رابطہ کریں۔ وہ رقم ٹرانسفر کا طریقہ بتا دیں گے۔''

''مگر میں آپ کی دولت نہیں لینا چاہتا۔'' میں نے فوراً جواب دیا۔

''پلیز بھائی!'' اس نے لکھا: ''آپ کے انکار سے مجھے افسوس رہے گا۔''

''ٹھیک ہے میں سوچ کر بتاؤں گا۔'' میں نے لکھا اور سائن آؤٹ ہو گیا۔ مجھے گھر کے کام کے لیے مارکیٹ تک جانا تھا۔ میں کاروباری شخص تھا۔ دولت کبھی میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہی تھی مگر زیادہ سے زیادہ کی جستجو ہر انسان کی فطری خواہش ہے۔ اس خواہش نے مجھے امریکی وکیل سے رابطہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ یہ جان کر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا کہ تیس لاکھ ڈالرز میرے انتظار میں تھے۔ رومان رقم کی منتقلی کے تمام انتظامات کر کے آئی تھی۔ بس مجھے اپنا بینک اکاؤنٹ نمبر بتانا تھا اور رقم پاکستانی روپوں کی صورت میں میرے اکاؤنٹ میں منتقل ہو جاتی۔ مجھے حیرت انگیز خوشی تھی۔ میں ایک کروڑ پتی شخص بننے والا تھا۔ جی ہاں! وہ رقم پاکستانی روپوں کی صورت میں آنے کے بعد کروڑوں روپے بنتی تھی۔

اس رات میرا کزن دلشاد کراچی سے آیا۔ وہ میرا بہت اچھا دوست تھا۔ میں نے اسے رازدار بنایا تو وہ چونکا: ''شہزاد بھائی! یہ سب فراڈ ہے۔'' وہ اعتماد کے ساتھ بولا۔

''کیا مطلب؟'' مجھے غصہ آ گیا: ''میں نے خود رومان کا اکاؤنٹ چیک کیا تھا۔ وہ امریکہ کا ایک مشہور بینک ہے۔''

''مگر یہ سب کچھ ایک سراب ہے۔ دھوکا ہے۔ جس ویب سائیٹ کو تم نے چیک کیا، وہ بنائی ہی اس مقصد کے لیے گئی ہے۔ یہ فراڈیے ایک منظم تنظیم کی شکل میں کام کرتے ہیں اور پوری دنیا میں ہزاروں لوگ اپنی دولت کا ایک بڑا حصہ گنوا کر ان کا شکار ہوتے ہیں۔''

''مگر میرا تو ایک روپے کا نقصان نہیں ہوا۔'' میں نے اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔

''نہیں ہوا مگر ہونے والا تھا، کیوں کہ تم آخری مرحلے میں ہو۔ رومان نے جس بینک کے منیجر کا نمبر دیا، اس پر رابطہ کرو اور اپنا تعارف کروا کر رقم کی منتقلی کے بارے میں معلومات حاصل کرو۔''

میں نے اسی وقت نمبر ملایا اور انگریزی میں گفتگو کرتے ہوئے اپنا مدعا بیان کیا۔ بینک کے منیجر نے مجھے مبارک باد دی۔ کچھ قانونی باتیں بتائیں۔ میرا اکاؤنٹ نمبر دریافت کیا۔ آخر میں کہا کہ اس بڑی رقم کو منتقل کرنے، پاکستانی روپوں میں تبدیل کرنے کے کچھ اخراجات ہیں جو مجھے برداشت کرنا ہوں گے۔ میں نے کہا کہ جو رقم میرے اکاؤنٹ میں منتقل ہونی ہے، آپ تمام اخراجات اس میں سے کاٹ لیں۔ اس نے کہا کہ وہ رقم آپ کے لیے فکس ہو چکی ہے۔ اس میں سے ایک ڈالر بھی نہیں نکالا جا سکتا۔ اس نے مجھے ایک اکاؤنٹ نمبر اور بینک کا نام لکھوایا اور کہا کہ اخراجات کی رقم آپ مجھے بھیجیں۔ جتنی جلدی رقم آپ بھیجیں گے، اتنی جلدی آپ کے اکاؤنٹ میں تیس لاکھ ڈالرز ٹرانسفر ہو جائیں گے۔ اس نے مجھے مطلوبہ رقم بتائی اور کال کٹ گئی۔

''اب بولو!'' میرا کزن بولا: ''انھوں نے اخراجات کی مد میں کتنی رقم مانگی ہے؟''

''پندرہ سو ڈالرز۔'' میں نے جواب دیا۔

''یعنی کہ ایک لاکھ بیس ہزار پاکستانی روپے۔'' وہ جوش سے بولا: ''اللہ کا شکر ادا کرو کہ تم بچ گئے۔ جو شخص کروڑ پتی بننے والا ہو، اگر اسے اپنے گھر کا سارا سامان بیچ کر بھی یہ رقم بھیجنی پڑے، وہ ضرور بھیجے گا۔ لالچ بری بلا ہے۔''

دلشاد کچھ اور بھی کہہ رہا تھا مگر میں حیرت سے سوچ رہا تھا کہ دولت حاصل کرنے کے لیے کیا کیا طریقہ اپنایا جاتا ہے۔ آج کل کی نوجوان نسل تو ہر وقت انٹرنیٹ میں گھسی رہتی ہے۔ انٹرنیٹ استعمال کرنے والے سب دوستوں سے گزارش ہے کہ ہوشیار رہیں اور انٹرنیٹ پر ہونے والے کسی بھی فراڈ کا حصہ مت بنیں۔ شکریہ!

☆ ایک شخص زور زور سے یہ دعا مانگ رہا تھا، یا اللہ تو مجھے چھپکلی بنادے، تو مجھے چھپکلی بنادے، کسی نے پوچھا تم یہ دعا کیوں مانگ رہے ہو، جواب میں اس نے کہا:
''میری بیوی چھپکلی سے بہت ڈرتی ہے۔''

☆ ایک صاحب خودکشی کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔
''خودکشی گناہ ہے، حرام موت ہے، بہت بری موت ہے، بے غیرتی کی موت ہے، غرض اس قدر بری ہے کہ اس سے تو بہتر ہے بندہ خود کو گولی مار لے۔''
(حافظ محمد عبدالرزاق۔ ڈیرہ اسماعیل خان)

☆ ایک شخص کھلے مین ہول میں گر گیا۔ وہ مدد کے لیے چلانے لگا۔ ایک دوسرے راہگیر نے مین ہول میں جھانک کر اس سے پوچھا۔
''کیا آپ اس مین ہول میں گر گئے ہیں؟''
اس نے جل کر کہا:
''جی نہیں! کارپوریشن والے آئے تھے، وہ میرے اوپر مین ہول بنا گئے ہیں۔

☆ بس میں ایک شخص اپنی دواؤں کو فروخت کرنے کے لیے ان کی بڑی تعریف کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا:
''میں بیس سال سے یہ دوائیں فروخت کر رہا ہوں، آج تک کسی نے شکایت نہیں کی۔''
بس کے ایک کونے سے آواز آئی:
''بھلا مردے بھی کبھی شکایت کیا کرتے ہیں۔'' (محمد طیب طاہر۔ فیصل آباد)

☆ جج: تم پر دو الزام ہیں۔ تم نے وزیر صحت کو جاہل کہا۔
سیاست دان: یہ دو الزام کیسے ہوئے جناب؟
جج: ایک یہ کہ وزیر صحت کو گالی دی، دوسرے یہ کہ سرکاری راز فاش کیا۔

☆ ماں: منے! یہ دروازے پر گندے ہاتھوں کے نشانات تمہارے ہیں؟
بیٹا: جی نہیں امی جان! میں تو لات مار کر دروازہ کھولتا ہوں۔

☆ شوہر: بیگم! آخر تم یہ بات کیسے کہہ سکتی ہو کہ ہمارا منا بڑا ہو کر سیاست دان بنے گا
بیوی: وہ ایسی باتیں کرتا ہے جو کانوں کو بہت بھلی لگتی ہیں، لیکن اس کا مطلب کچھ نہیں نکلتا۔ (حافظ نوید احمد عجمی۔ بہبودی اٹک)

☆ استاد: کن ممالک میں سونا زیادہ پایا جاتا ہے۔
شاگرد: جن ممالک میں راتیں لمبی ہوتی ہیں۔

☆ چور سارے گھر کے مال و اسباب کے ساتھ جب جائے نماز بھی لے جانے لگا تو مالک مکان نے کہا: ''یہ تو چھوڑ جاؤ۔''
چور نے کہا: ''کیا میں تمہیں کافر نظر آتا ہوں۔''

☆ ایک سردار خشک دریا میں کشتی چلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک دوسرے سردار نے اسے ایسا کرتے دیکھا تو بول اٹھا:
''ایسے ہی سرداروں نے ہمیں بدنام کر رکھا ہے۔ اگر مجھے تیرنا آتا تو میں ابھی اس کا دماغ درست کر دیتا۔ (محمد ابراہیم۔ گوجرہ)

☆ ایک شخص نے آدھ کلو مٹھائی ہڑپ کرنے کے بعد مٹھائی والے سے کہا:
''بھائی منہ میٹھا کرنے کے لیے تھوڑی سی برفی دے دو۔''
مٹھائی والے نے جل کر کہا:
''تو کیا اب تک آپ صابون کھاتے رہے ہیں۔'' (محمد عمر فاروق۔ مانسہرہ)

مُختصر پُر اَثر

☆ شیخ التفسیر حضرت مولانا ادریس صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ کا مطالعہ اور علمی ذوق بڑا مشہور ہے، طالب علمی میں دل کے دورے کی شکایت ہوگئی، اکثر بے ہوش ہو جاتے۔ جونہی ہوش آتا تو دوبارہ مطالعے میں مشغول ہو جاتے۔ آپ کے بارے میں مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آپ مطالعے کے اتنے شوقین تھے کہ ہر وقت دار العلوم کے کتب خانے پر مسلط رہتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک کتاب خریدنے کی خواہش کی۔ پیسے نہیں تھے تو خریدنے کے لیے اپنے کپڑے فروخت کر کے اس رقم سے کتاب خریدی۔
(حافظ محمد اشرف۔ حاصل پور ضلع بہاول پور)

☆ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کہیں جا رہے تھے کہ بہترین لباس میں ایک خوب صورت سکھ کو دیکھا، آپ نے ''آہ'' کہا۔ سکھ نے ''آہ'' سن کر پوچھا کہ آپ نے ''آہ'' کیوں کہا؟ فرمایا: اس لیے کہ اتنا خوب صورت آدمی اور جہنم میں جا رہا ہے، سکھ نے کہا، مجھے کلمہ پڑھاؤ اور مسلمان ہو گیا۔
(بنتِ افضال احمد عباسی)

☆ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ تشریف لے جا رہے تھے۔ سواری کے لیے اونٹ کے علاوہ ایک گدھا بھی تھا۔ اونٹ کی سواری سے تھک جاتے تو آسانی اور آرام کے لیے گدھے کی سواری کرتے تھے اور پاس ایک عمامہ تھا جسے وہ سر پر باندھے رکھتے تھے۔

ایک دن اپنے گدھے پر جا رہے تھے کہ ایک دیہاتی سے ان سے ملاقات ہوگئی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا کہ تو فلاں کا بیٹا اور فلاں کا پوتا ہے؟ اس نے کہا: جی ہاں! انھوں نے اس دیہاتی کو گدھا دے دیا اور فرمایا: اس پر سوار ہو جا اور عمامہ بھی دیا اور فرمایا کہ اسے اپنے سر پر باندھ لے۔

ان کے بعض ساتھیوں نے (بڑے تعجب سے) کہا: ''اللہ تعالیٰ آپ کی مغفرت فرمائے، آپ نے اپنی آرام دہ سواری گدھا اور عمامہ بھی اسے دے دیا جسے آپ سر پر باندھتے تھے (یعنی یہ تو آپ کی ضرورت کی چیزیں تھیں) پس آپ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ:
''نیکیوں میں سے بڑی نیکی یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ کے مرنے کے بعد ان کے دوستوں سے حسنِ سلوک کرے اور اس دیہاتی کا باپ میرے والد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دوست تھا (پس میں نے اس تعلق کی وجہ سے اس کا اکرام کیا)۔''
(صحیح مسلم: 2552)

☆ حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ ایک مرتبہ مدینہ پاک سے واپس ہونے لگے تو گنبدِ 'خضریٰ' پر آخری نظر ڈالی اور یہ شعر پڑھا جس سے دیارِ حبیب کی محبت جھلکتی ہے۔

ہزاروں بار تجھ پر اے مدینہ میں فدا ہوتا
جو بس چلتا تو مر کر بھی نہ میں تجھ سے جدا ہوتا

(بنتِ افضال احمد عباسی)

آمنے سامنے

☆ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ: ہم بچوں کا اسلام کے بچپن سے قاری ہیں اور اسے شوق سے پڑھتے ہیں۔ بچوں کا اسلام ہمارے گھر آتا ہے تو کھینچا تانی پیدا ہوجاتی ہے۔ یہ ہمارا کسی بھی رسالے میں پہلا خط ہے۔ ہم بچوں کا اسلام کے آمنے سامنے میں صرف وہ خط پڑھتے ہیں جن کے نیچے آپ جواب لکھتے ہیں۔ اللہ آپ کو حج اور عمرے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ (حور ابیہا۔ نور پور نورنگا)

ج: میری طرف سے بھی آمین۔

☆ شمارہ 583 کی دو باتیں بلکہ اوٹ پٹانگ پڑھنے کا شرف حاصل کیا۔ بہت ہی مزہ آیا۔ ہائے رے موبائل، دلچسپ اور نصیحت آموز تھی۔ واقعات صحابہ کے قدم بہ قدم بہت اچھائی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ خاموش ہتھیار، دلکش سسپنس کے ساتھ اپنی منزل کی طرف گامزن ہے۔ شاہد حفیظ نے پیارے انداز میں قلم کو حرکت دی۔ ہم سفر پسند آئی۔ مولانا محمد ہاشم عارف صاحب کا کوہِ طور کا سفرنامہ اپنے اختتام کو پہنچا۔ ان سے مزید سفروں کی درخواست ہے۔

(محمد ابراہیم قاسمی۔ ملتان)

ج: میں بھی مولانا محمد ہاشم عارف صاحب سے یہی درخواست کرتا ہوں۔

☆ کیا ہم اپنی تحریریں جھنگ کے پتے پر بھیج سکتے ہیں۔ جوابی لفافہ ارسال ہے۔ کوئی مشورہ لکھ دیں۔ کوئی محبت کی بات لکھ دیں۔ کیا میں صفحے کے دونوں طرف اور لائن چھوڑ کر لکھ سکتا ہوں۔ (محمد عثمان حبیب۔ کہروڑ پکا)

ج: چیزوں کی اشاعت کے لیے کاغذ کے ایک طرف اور ایک سطر چھوڑ کر لکھنا ہی درست طریقہ ہے، ورنہ مضامین کی اصلاح نہیں ہوسکتی اور جن کی اصلاح نہ ہوسکے، ان کے لیے ردی کی بالٹی ہی جگہ ہے۔ جھنگ کے پتے پر بھیج سکتے ہیں۔

☆ 581 سارا شمارہ ہی دلچسپ تھا۔ نیا نیوز چینل مزاح سے بھرپور تھا۔ کہانی عید کا تحفہ اول نمبر پر رہی۔ مسکراہٹ کے پھول اس بار اچھے تھے مگر مختصر پر اثر میں ایک غلطی نظر آئی۔ بنتِ مولانا سیف الرحمٰن نے ایک واقعہ لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ اس نشان دہی پر غور کریں۔

(محمد اسد ارشد۔ لاہور کینٹ)

ج: آپ اس واقعے کو سمجھ نہیں سکے۔ جب کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو اپنے بڑوں سے پوچھ لیا کریں۔

☆ ہم بچوں کا اسلام کے چھ سال پرانے قاری ہیں۔ ہم نے اپنی امی جان سے دعا کرائی ہے کہ ہمارا خط شائع ہوجائے۔ خط شائع ہوگیا تو آپ کے لیے پورا رمضان دعا کریں گے۔ شمارہ 576 کی سبھی کہانیاں پسند آئیں۔ فالسے اول نمبر پر رہی۔ زندگی ایک امانت اور تین نسلیں بھی زبردست تھیں۔ سو سالہ ایڈیٹر کہانی کا کوئی مقصد نہیں تھا۔ (زوبیلہ، انسا شاہد۔ کراچی)

ج: آپ کی امی کی دعا قبول ہوگئی۔

☆ 579 پڑھا۔ زبردست تھا۔ عشرت جہاں کی وفاؤں کا سودا پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آگئے۔ شگفتہ کنول کی آئیڈیل بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہوگئی۔ ہم زبان سے بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں کہ ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت محبت ہے۔ آپ ہمارے آئیڈیل ہیں، لیکن عمل کے اعتبار سے زیرو ہیں۔ آپ کی دو باتیں میں بہت ترس آیا۔ (سحر بنتِ شفیق احمد بٹ۔ میر پور خاص)

ج: کسی کو ترس تو آیا۔

☆ کچھ ہی مدت پہلے مطالعے کے سمندر سے نکلا ہوں۔ نکلتے ہی قلم کاغذ سنبھالا اور کچھ کہانیاں لکھ ماریں اور کہانیاں شروع کر دیں۔ مطلب یہ کہ ایک بار پھر کہانیوں کے ساتھ حاضر ہوں۔ (محمد حماد ذیشان۔ ڈیرہ غازی خان)

ج: اللہ کا شکر ادا کریں۔

☆ شمارہ 577 ہاتھوں میں ہے۔ اس بار حافظ عبدالجبار صاحب نے پہلے سے بھی زیادہ کمال کی کہانی لکھی ہے۔ بے زبان جانوروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا بہت اچھا سبق دیا ہے۔ بہت اچھا نذرانہ تھا۔ سونے کی زنجیر میں نواب حیدر نے دیانت داری کے پہلو کو بڑے اچھے انداز سے اجاگر کیا، لیکن طوالت زیادہ دی گئی۔ گرتی دیوار مصنوعات کے بائیکاٹ کے اچھے مشورے تھے۔ شاگرد کی واپسی بھی اچھی تحریر تھی۔ مسکراہٹ کے پھول میں کوئی بھی لطیفہ پسند نہیں آیا۔

(ربیعہ اصغر۔ نندووال)

ج: مسکراہٹ کے پھول کچھ ناراض ہیں۔

☆ سالنامے کے لیے کچھ کہانیاں اور مسکراہٹ کے پھول ارسال کیے تھے مگر آپ نے بڑی معصومیت سے ردی کی بالٹی کے حوالے کردیے۔ اس لیے ہم ردی کی بالٹی کے خلاف بچوں کا اسلام کی عدالت میں مقدمہ درج کروا رہے ہیں۔ اب آپ دیکھ لیں، مضامین شائع کرنے ہیں یا مقدمے کا سامنا کرنا ہے۔

(محمد حذیفہ حیدر۔ پنج گرائیں)

ج: جی اچھا! دیکھ لیتا ہوں۔

☆ آپ خطوط کے ڈھیر کے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ شمارہ 580 ہاتھ میں ہے۔ زہر کا ٹیکہ پڑھ کر سوچ میں ڈوب گئے۔ کیا کوئی اس طرح بھی سوچ سکتا ہے۔ میری کہانی میری زبانی کے آخر میں تھا، کیونکہ میں تمہاری ہی کراچی ہوں۔ شہر تو مذکر ہوتے ہیں انکل! (روبینہ ناز۔ کراچی)

ج: جی ہاں! ہوتے تو مذکر ہی ہیں، لیکن یہاں کراچی اپنی کہانی سنا رہی تھی نا۔

☆ بچوں کا اسلام کے بہت پرانے قاری ہیں۔ یہ بہت زبردست اسلامی رسالہ ہے۔ ہمیں وہ خطوط اچھے لگتے ہیں جن کے نیچے آپ جوابات لکھتے ہیں۔ لکھنے والوں میں ہمیں بینا رانی، سرور مجذوب، حافظ عبدالجبار اور محمد شاہد فاروق بہت پسند ہیں۔ اللہ تعالیٰ مزید ترقی عطا فرمائے۔ آمین۔ (عکاشہ فاروق۔ حافظ والا)

ج: اسی لیے اب میں کوشش کرتا ہوں کہ ہر خط کے نیچے کچھ نہ کچھ جواب لکھ دوں۔

☆ شمارہ 583 ملا۔ ہائے رے ہوٹل میں ایک لفظ پانچ ستارہ ہوٹل (فائیو سٹار ہوٹل) نے بہت متاثر کیا۔ دریا میں ڈال بہت ہی سادا اور مانوس انداز میں پر اثر تحریر تھی۔ تھوڑی سی غفلت نے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وردہ کے ماں باپ پر کیا بیتی ہوگی۔ آج کل مزاحیہ لکھنے والے گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہیں۔ اس شمارے میں نیوز چینل کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔

(خولہ بنتِ قاری محمد شفیق پانی پتی۔ جھنگ صدر)

ج: نیوز چینل تو پہلے بھی ہر شمارے میں نہیں ہوتا۔

☆ شمارہ 577 پڑھا۔ بہت ہی شان دار تھا۔ خاص طور پر گرتی دیوار اور شاگرد کی واپسی بہت ہی پسند آئیں۔ بہترین ناول نگار کا ایوارڈ ملنے پر آپ کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد۔ میں شمارہ 59 سے بچوں کا اسلام کا قاری ہوں۔ مجھے شروع کے 55 شمارے درکار ہیں۔ (وسیم اعوان۔ کراچی)

ج: آپ تو خود کراچی میں رہتے ہیں۔ دفتر سے حاصل کرسکتے ہیں۔

فوزیہ خلیل ۔ کراچی

''بابا جان! کیا آپ کو معلوم ہے۔ کاشان چاچو کے گھر میں آج کل کیا ہو رہا ہے؟'' بہروز نے اپنے والد سے سوال کیا جو کہ ٹی وی کے سامنے بیٹھے ریموٹ کنٹرول سے چینل بدل رہے تھے۔

''بابا جان! آپ سن رہے ہیں۔'' بہروز نے دوبارہ پوچھا۔

''نہیں! ابھی کچھ سننا بھی نہیں چاہتا۔ ابھی میں یہ پروگرام دیکھ رہا ہوں۔''

''مگر میں آپ کو سنائے بغیر نہیں رہ سکتا بابا جان! کاشان چاچو کے گھر آج کل زبردست لڑائی جھگڑا ہو رہا ہے۔ چاچو اپنے ہی بچوں کو اس بری طرح مار رہے ہیں کہ میرا دل دہل جاتا ہے۔ بچوں کی آہ و بکا سن کر اور پھر فاصلہ ہی کتنا ہے۔ پڑوس میں تو گھر ہے اُن کا۔'' بہروز یہاں تک کہہ کر چند لمحے رُکا اور اپنے بابا جان کے جواب کا انتظار کرنے لگا:

''بولیے ناں بابا جان! آپ کو پریشانی نہیں ہوئی۔''

''پریشانی۔'' انھوں نے کچھ لمحے رک کر کہا۔ پھر بولے:

''ہاں مجھے معلوم ہے۔ آوازیں، چیخنا، رونا، سب مجھے بھی سنائی دے رہا ہے۔ آخر میں بھی اسی گھر میں رہتا ہوں۔ رونے کی آوازیں ہوتی ہی اس قدر بلند ہیں۔''

''آخر! کاشان چاچو اپنے بچوں کو اس قدر بے دردی سے کیوں مار رہے ہیں۔ اُن کے بچے نیک اور صالح بچے ہیں۔ مگر کاشان چاچو کتنے سنگ دل ہیں بابا۔ آپ اُن کے بچوں کی چیخ و پکار سنتے ہیں تو پھر کچھ کرتے کیوں نہیں۔ مجھے تو آپ پر بڑی حیرت ہو رہی ہے۔'' بہروز نے جلدی جلدی کہا۔

''خاموش رہو بہروز۔ اتنا اچھا ڈرامہ آ رہا تھا ٹی وی پر۔ خواہ مخواہ بولے جا رہے ہو۔ جاؤ۔ بھاگو یہاں سے۔'' بابا جان نے اونچی آواز میں اُسے ڈانٹا اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

بہروز کے والد، کاشان چاچو اور بہروز کے دوسرے چاچا، تایا سب ایک ہی گلی میں رہتے تھے۔ سب کے قریب قریب مکان بنے ہوئے تھے۔ بہروز خاموشی سے اپنے گھر سے نکلا۔ ذرا ہی دیر میں وہ اپنے فیضان تایا کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا:

''تایا جی! آپ کچھ کیجیے خدارا! کاشان چاچو اپنے معصوم بچوں کو بہت ہی بے دردی سے مار رہے ہیں۔ کئی دن ہو گئے انھیں یہ ظلم کرتے، رات ہو یا دن، مجھے ان کے بچوں کے چلانے کی آوازیں آتی ہیں۔'' بہروز نے دروازہ کھلتے ہی بولنا شروع کیا۔

''آوازیں! وہ تو آج کل ہمیں بھی آ رہی ہیں۔'' فیضان تایا بڑبڑائے۔

''پھر جایئے ناں! چاچو کو روکیے ناں۔'' بہروز نے گڑگڑا کر کہا۔

''بھئی بہروز! میں پرائے جھگڑے میں نہیں پڑتا۔''

''پرایا جھگڑا! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ کیا کاشان چاچو آپ کے سگے بھائی نہیں ہیں۔'' بہروز رو دیا۔

''اچھا! ابھی تو جاؤ۔ پھر کبھی آنا۔ ابھی تو ہم دعوت میں جا رہے ہیں۔ وہاں سے گھومنے بھی جائیں گے۔'' انھوں نے کھٹ سے اپنا دروازہ بند کر لیا۔

بہروز برہان چاچا کے گھر کی طرف مڑ گیا۔ وہاں دیر تک دروازہ بجاتا رہا مگر برہان چاچا دروازے پر آئے ہی نہیں۔ اُن کے چھوٹے بچے نے دروازے پر آ کر کہہ دیا کہ رات گئے تک فلمیں دیکھتے رہے ہیں، لہٰذا اب دن چڑھے تک سوتے رہیں گے۔''

بہروز پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

اذان کی آواز بلند ہوتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور مسجد کی طرف بڑھ گیا۔ نماز پڑھ کر وہ دیر تک دعائیں مانگتا رہا۔ مسجد خالی پڑی تھی۔ وہاں اکا دکا نمازی تھے۔ وہ بھی اللہ کے حضور گڑگڑا رہے تھے۔

بہروز اٹھ کر ابھی مسجد سے باہر نکلنے کو تھا کہ اُسے ایک بہت ہی نورانی اور حسین بزرگ نظر آئے۔ تھے تو بہت نورانی، مگر حد درجہ کمزور تھے۔ مسجد کے ایک کونے میں بیٹھے تھے۔ اُن کی وجہ سے مسجد جگمگاتی محسوس ہو رہی تھی۔ بہروز لپک کر اُن کے پاس گیا اور سلام کیا:

''آپ کون ہیں۔ جناب۔''

''میں اسلام ہوں۔ تمہارا مذہب۔'' وہ بولے اور اُن کے موتیوں جیسے خوب صورت دانت جگمگانے لگے۔

بہروز نے لپک کر اُن کے ہاتھ تھام لیے۔

''میں بہت پریشان ہوں۔ جناب! میری مدد کیجیے۔'' بہروز نے روتے ہوئے اپنے والد کا قصہ، کاشان چاچو کا سلوک، اُن کے بے گناہ بچوں کا ظلم سہنا، اپنے چچاؤں اور تایا کی بے حسی کے تمام حالات کہہ سنائے۔

''میرے بچے! تمہارے کاشان چاچو کی مثال اس وقت ایسی ہے جیسے کہ مصر۔ مصر کی فوج اپنے ہی بے گناہ اور نہتے شہریوں پر حملے کر رہی ہے۔ اس وقت کوئی ان کی مدد کرنے والا نہیں۔ مصر کے تمام مسلمان بھائی بالکل ایسے خاموش اور بے زار ہیں جیسے تمہارے والد، تایا اور باقی چچا۔ روکنا تو بہت دور کی بات، کوئی آواز اٹھانے والا بھی نہیں۔ 57 مسلم ممالک کے سربراہ بالکل دم سادھے بیٹھے ہیں۔ اقتدار کی جنگ ہے۔ اقتدار حاصل کر لینے کا ایک نشہ ہے۔ ہر ایک تسلیم کرتا ہے کہ موت آ کر رہے گی۔ موت سے چھٹکارہ نہیں۔ لمبی زندگی کی تمنائیں لیے بیٹھے ہیں۔ چند روزہ زندگی کے لیے ایمان کا سودا کر بیٹھے ہیں۔'' نورانی بزرگ خاموش ہو چکے تھے۔ ایک گہری خاموشی تھی۔ ایک سناٹا تھا۔ بہروز اپنا دل دھڑکتا صاف محسوس کر رہا تھا۔

''میرے بچے! مسلمانوں کو یہودی سازشوں کا مقابلہ کرنا ہوگا، ورنہ باری باری تم سب یہودی سازشوں کا شکار ہو جاؤ گے۔ ایک کے بعد ایک۔''

''نہیں نہیں! ایسا نہیں ہوگا۔'' بہروز اٹھ کھڑا ہوا۔

''ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ہم سب مسلمان بھائی ہیں۔ ہماری تعداد ڈیڑھ ارب سے زاید ہے۔ ہم ایک ہیں۔ ہم مسلمان یہودیوں کی سازشوں کا شکار نہیں ہوں گے۔ ماتم کرنا مسلمان کا مقدر نہیں۔ ہم سب ظلم کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ ہم مل کر سوئے ہوؤں کو جگائیں گے۔''

یہ کہتے ہوئے بہروز نے نعرہ تکبیر بلند کیا اور مسجد سے نکل آیا۔ اس کے زور دار نعرے کی آواز سن کر آس پاس کے دروازے کھلنے لگے۔

☆☆☆